928.91439
NOO
6245

ابتدائی زندگی

مغربی اتر پردیش کے ضلع بجنور میں ایک چھوٹی سی تحصیل نگینہ ہے۔ اس کے ایک گاؤں ریہڑ پرگنہ افضل گڑھ میں نذیر احمد کی ننہیال آباد تھی۔ یہ ایک آسودہ حال گھرانا تھا۔ انھوں نے اپنے داماد مولوی سعادت علی یعنی نذیر احمد کے والد کو خانہ داماد بنا کے اپنے ساتھ ہی رکھ لیا تھا۔ نذیر احمد اسی گاؤں میں پیدا ہوئے تاریخ ولادت کے سلسلے میں کوئی مستند شہادت موجود نہیں لیکن ان کے پہلے سوانح نگار سید افتخار عالم بلگرامی نے بہت چھان بین کے بعد تاریخ ولادت ۶/ دسمبر ۱۸۳۶ء متعین کی ہے۔

مولوی سعادت علی کے خسر نے انتقال کیا تو جائیداد کے سلسلے میں جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چنانچہ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بجنور منتقل ہو گئے جہاں ان کا آبائی مکان موجود تھا۔ اس وقت نذیر احمد کی عمر چار برس کی تھی۔ بجنور آنے کے بعد مولوی سعادت علی کو گزر اوقات کی فکر ہوئی۔ انھوں نے شکر کا چھوٹا سا کاروبار شروع کیا مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر گھر گھر جا کے رئیسوں کے بچوں کو پڑھانے لگے اور کسی نہ کسی طرح گزر ہونے لگی۔ نذیر احمد کو انھوں نے کچھ دن خود پڑھایا پھر ایک مکتب میں داخل کر دیا مگر کچھ ہی دن بعد انھیں مکتب سے اٹھا لینا پڑا۔ دراصل نذیر احمد ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ بچپن میں بہت شریر بھی تھے اور شاید مکتب کے ملاجی کے قابو میں نہ آتے تھے۔ چلبلے ایسے تھے کہ حجامت بنوانے میں بھی چین سے نہ بیٹھتے بار بار اٹھ کے بھاگتے تھے اور پکڑ پکڑ کے لائے جاتے تھے تب کہیں گھنٹوں میں حجامت بنتی تھی۔

CHECKED-2019

جسم پر جا بجا چوٹوں کے نشان تھے۔ یہ سب شرارتوں کی نشانیاں تھیں۔

غرض یہ کہ والد صاحب نے کچھ دنوں خود پڑھایا۔ پھر مزید تعلیم کے لیے مولوی نصراللہ خاں کے سپرد کر دیا۔ مولوی صاحب عالم تھے اور اس وقت بجنور میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر مامور تھے۔ نذیر احمد کے خاندان سے ان کے پرانے مراسم تھے۔ خاں صاحب کو درس و تدریس سے بہت دل چسپی تھی۔ انھوں نے بڑے شوق سے اس ذمہ داری کو قبول کر لیا۔ نذیر احمد اور ان کے بڑے بھائی علی احمد، خاں صاحب سے پڑھنے لگے۔ کچھ عرصے بعد خاں صاحب کا مظفر نگر کو تبادلہ ہو گیا۔ وہ دونوں بھائیوں کو اپنے ساتھ مظفر نگر لے گئے اور تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ ایک بار مولوی سعادت علی اپنے بیٹوں سے ملنے مظفر نگر گئے۔ اس وقت خاں صاحب کا تبادلہ اعظم گڑھ کو ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی مصروفیت میں اضافہ ہو چکا تھا اور ان دونوں بھائیوں کو تعلیم دینے کے لیے مطالعے کی بھی ضرورت ہوتی تھی۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ ان بچوں کو دہلی بھیج دینا چاہیے تاکہ ان کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہ سکے۔ نذیر احمد اس وقت تک عربی کی بنیادی کتابیں پڑھ چکے تھے۔

بچوں کو مزید تعلیم کے لیے دہلی بھیجنے کی تجویز مولوی سعادت علی کو درست معلوم ہوئی۔ اوّل تو دہلی میں جا بجا عربی کے مدرسے قایم تھے۔ دوسرے کسی مسجد میں رہائش کا بندوبست دشوار نہ تھا اور تیسرے یہ کہ طالب علم دستِ سوال دراز کر سکے تو کھانے کا مفت انتظام بھی ممکن تھا اور مولوی سعادت علی کی اتنی حیثیت نہ تھی کہ وہ ان بچوں کا خرچ برداشت کر سکیں۔

آخر کار یہ دہلی پہنچے۔ دہلی میں اجمیری دروازے کے نزدیک ایک محلے میں پنجابی مسلمان آباد تھے۔ اس وجہ سے یہ محلہ پنجابیوں کا کٹرہ کہلاتا تھا۔ بعد کو اس محلے کا بیشتر حصہ ریلوے لائن کی نذر ہو گیا۔ اس محلے کی مسجد میں، جو اورنگ آبادی مسجد کے نام سے مشہور تھی، عربی کا مدرسہ قایم تھا۔ یہاں مولوی عبدالخالق درس دیتے تھے اور نزدیک ہی ان کی رہائش تھی۔ یہاں نذیر احمد کو بعض ایسے تجربے ہوئے جن کی تلخی آخر وقت تک باقی رہی۔ انھوں نے غصّے سے مسجد

کو بھٹیارخانہ بتایا ہے کیونکہ وہاں رہائش کے عوض کم عمر لڑکوں کو مولویوں کے زنان خانے میں خدمت گار کے فرائض انجام دینے پڑتے تھے۔

کھانے کا انتظام ہر طالب علم کو خود کرنا پڑتا تھا اور اس کی تین صورتیں تھیں۔ کچھ طالب علم دوسری مسجدوں میں امام و مؤذن کی خدمت انجام دیتے اور اس کے بدلے روٹی کپڑا پاتے تھے۔ کچھ طالب علم گھر گھر جا کے بچوں کو پڑھاتے تھے۔ کسی نے ناشتہ کرا دیا، کسی نے دوپہر کا کھانا دے دیا تو کسی نے رات کا۔ تیسرا گروہ ان لڑکوں کا تھا جو چھبڑا لے کے نکل جاتا اور پنجابیوں کے گھروں سے باسی روٹی، بچا ہوا سالن اور سوکھے ٹکڑے بٹور لاتا۔ ہمارے نذیر احمد اسی گروہ میں شامل تھے۔ انھوں نے اپنے شاگرد مرزا فرحت اللہ بیگ کو بتایا تھا۔

> "پڑھنے کے علاوہ میرا کام روٹیاں سمیٹنا بھی تھا۔ صبح ہوئی اور میں چھبڑی لے گھر گھر روٹیاں جمع کرنے نکلا۔ کسی نے رات کی بچی ہوئی دال ہی دے دی۔ کسی نے قیمے کی لگدی ہی رکھ دی۔ کسی نے دو تین روٹیوں پر ٹرخایا۔ غرض رنگ برنگ کا کھانا جمع ہو جاتا۔"[1]

گویا اُن دنوں نذیر احمد کی گزر اوقات صدقہ و خیرات پر تھی۔ ان کی عمر تو بارہ برس کی تھی مگر قد چھوٹا تھا اس لیے نو دس برس کے لگتے تھے۔ اتنے سے بچے کو کون امام و مؤذن کی نوکری دیتا اور کون اس سے اپنے لڑکوں کو پڑھوا لیتا۔ اس لیے گداگری کے سوا چارہ نہ تھا۔

اسی کم عمری نے نذیر احمد کو ایک اور مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ ان کے استاد مولوی عبدالخالق نے ان کے سپرد یہ کام کیا کہ روزانہ بلاناغہ ان کے گھر جائیں، بازار سے سودا لا کر دیں اور اُوپر کے کاموں میں ہاتھ بٹائیں۔ یہ بڑا صبر آزما کام تھا، خاص طور پر اس لیے کہ مولوی صاحب کی

---

[1] مرزا فرحت اللہ بیگ: مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۸۱ء، صفحہ ۴۸

پوتی بڑی شوخ اور تند مزاج تھی بقول نذیر احمد کے :-

"ان کے ہاں میرا قدم رکھنا مشکل تھا۔ ادھر میں نے دروازے میں قدم رکھا اُدھر اس لڑکی نے ٹانگ لی۔ جب تک سیر دو سیر مصالحہ مجھ سے نہ پسوا لیتی نہ گھر سے نکلنے دیتی نہ روٹی کا ٹکڑا دیتی۔ خدا جانے کہاں سے محلے بھر کا مصالحہ اٹھا لاتی تھی۔ پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے جہاں میں نے ہاتھ روکا اور اس نے بٹہ انگلیوں پر مارا۔ بخدا جان سی نکل جاتی تھی"[1]

اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان صاحبزادی نے ہوش سنبھالا تو بیگم نذیر احمد بن گئیں۔ نذیر احمد کی صلاحیت اور ذہانت سے مولوی عبدالخالق کا سارا خاندان واقف تھا۔ جب انھیں دلّی کالج میں داخلہ مل گیا تو سب کو ان کی آئندہ ترقی کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ان سے بہتر لڑکا ملنا آسان نہیں۔ شادی کے بعد یہ صاحبزادی اپنی ساری شرارتیں بھول گئیں۔ مولوی نذیر احمد تو بڑے ہنسوڑ تھے۔ وہ انھیں پچھلی باتیں یاد دلا کے اکثر ستایا کرتے تھے۔ اپنی ٹیڑھ پڑی انگلیاں دکھا دکھا کے کہتے "نیک بخت، یہ سب تیری مار کے نشان ہیں" وہ بیچاری شرما کے سر جھکا لیتیں۔

مختصر یہ کہ مسجد اورنگ آبادی میں قیام کا زمانہ نذیر احمد کی زندگی کا سب سے بُرا زمانہ تھا۔ اس زمانے کی تلخ یاد کبھی ان کے ذہن سے محو نہ ہو سکی۔ وہ ہمیشہ اس نظامِ تعلیم پر حملے کرتے رہے۔ ان کو شکایت تھی کہ یہ مولوی ان لڑکوں کو طالب علم نہیں اپنا خدمتگار سمجھتے تھے اور تعلیم سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے۔ ان طالب علموں کے بارے میں بھی مولوی نذیر احمد کی رائے یہ تھی کہ مسجد میں رہنے اور مدرسے میں پڑھنے سے اکثر کا منشا تعلیم حاصل کرنا نہیں بلکہ صرف یہ تھا کہ مفت کی روٹیاں ملتی رہیں۔[2] لیکن خود نذیر احمد کا معاملہ مختلف تھا۔ مسجد میں کوئی سہولت

---

[1] بحوالہ مرزا فرحت اللہ بیگ، نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی۔

[2] سید افتخار عالم: حیات النذیر، شمسی پریس دہلی، ۱۹۱۲ء، صفحہ ۱۸۔

میسر نہ تھی لیکن یہ پورے انہماک سے تحصیلِ علم میں مشغول تھے۔ حد یہ ہے کہ کتابیں ناپید تھیں۔ دس بارہ طالب علموں کی جماعت ہوتی اور عموماً صرف ایک کتاب، چنانچہ ایک خوش نصیب پڑھتا اور باقی صرف سنتے۔ مسجد کا سنگی فرش گرمیوں میں تپتا اور سردیوں میں برف کی سل کی طرح سرد رہتا تھا۔ نذیر احمد کو کتاب میسر آجاتی تو اسی فرش پر کہنیاں ٹکا کر کتاب پر جھک جاتے اور گھنٹوں جھکے رہتے۔ ان کی کہنیوں کی کھال ایسی سخت ہوگئی تھی جیسے کسی نے سوکھے چمڑے کا پیوند لگا دیا ہو۔ یہ تھا نذیر احمد کا ذوقِ مطالعہ اور یہ نہ ہوتا تو آج انھیں کون جانتا۔ مسجد کے ناسازگار ماحول نے انھیں گمنامی کے اندھیرے میں دھکیل دیا ہوتا۔ اس ماحول کے بارے میں نذیر احمد کی تلخ رائے بھی سُن لیجیے:-

"مجھ کو تو کسی مولوی نے آپ پڑھایا اور نہ پڑھنے دیا۔ آپ نہیں پڑھایا تو خیر ایک بات ہے۔ شکایت تو اس کی ہے کہ پڑھنے بھی نہیں دیا۔ وہ اس طرح کہ مجھ جیسے کم عمر لڑکے مولویوں کے زنان خانے میں جاتے تھے اور ان سے خدمتگاری کا کام لیا جاتا تھا۔ معاوضہ اس کا کہ مسجد میں رہتے ہیں۔ پس مسجد ان کے لیے بھٹیاری کی سرائے تھی اور اس کا کرایہ مولویوں اور مولونوں کی خدمت۔ جس جس پہلو سے میں اس وقت کو یاد کرتا ہوں جب کہ میں پنجابی کٹڑے کی مسجد میں تھا تو پاتا ہوں کہ میری ساری عمر میں بدترین وقت تھا اور اگر اس کو چار پانچ برس کا بھی امتداد ہو تو میں دنیا اور دین دونوں طرف سے تباہ ہو لیا تھا۔"

لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ مسجد کی تعلیم نے زیادہ طول نہ کھینچا اور جلد ہی بہتر تعلیم کا موقع میسر آگیا۔ سچ ہے اگر انسان میں کچھ کر گزرنے کا جذبہ ہو تو آگے بڑھنے کے راستے آپ سے آپ ہموار ہوتے جاتے ہیں اور ترقی کی سبیلیں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ نذیر احمد کے ساتھ یہی ہوا۔

دلّی کالج میں داخلہ

دلّی کالج میں نذیر احمد کے داخلے کا واقعہ ایک کہانی سی معلوم ہوتا ہے۔ مسجد میں انھوں نے قرآن شریف ختم کرنے کے بعد ادب پڑھنا شروع کر دیا تھا اور چند سال کی محنت میں "معلقات"[1] تک پہنچ گئے تھے۔

اتفاق سے ایک دن ٹہلتے ٹہلتے دلّی کالج کے سامنے جا پہنچے۔ اس روز یہاں بہت رونق تھی۔ عربی کے ایک مشہور عالم مفتی صدرالدین آزردہ زبانی امتحان لینے آئے ہوئے تھے۔ تماش بینی کے شوق میں نذیر احمد بھی بھیڑ میں شامل ہو گئے۔ ذرا دیر میں پرنسپل صاحب کسی کام سے باہر نکلے۔ راستہ بنانے کے لیے چپراسیوں نے لوگوں کو دھکیلا تو نذیر احمد پھسل کے گر پڑے۔ پرنسپل نے یہ دیکھا تو بڑھ کے دل جوئی کی اور یونہی پوچھ لیا "کہاں پڑھتے ہو؟ کیا پڑھتے ہو؟" انھوں نے جواب دیا "پنجابیوں کے کٹرے کی مسجد میں پڑھتا ہوں اور معلقات پڑھ رہا ہوں۔" پرنسپل صاحب نے موٹی سی کتاب کا نام سنا اور حیرت سے ان کے چھوٹے سے قد کو دیکھا۔ وہ اپنے کام کو جانا بھول گئے۔ انھوں نے نذیر احمد کا ہاتھ پکڑا اور مفتی صاحب کے سامنے لے جا کے کھڑا کر دیا۔ بولے "مفتی صاحب یہ لڑکا کہتا ہے میں معلقات پڑھتا ہوں۔ ذرا امتحان لے کر تو دیکھیے" مفتی صاحب نے سوال پوچھے اور نذیر احمد نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیے۔ آخر پوچھا گیا "کالج میں پڑھو گے؟" یہ مولویوں کے ستائے ہوئے تھے، سمجھے یہاں بھی خدمتگاری کا کام لیا جائے گا۔ پوچھا "یہاں مجھے کیا کام کرنا ہوگا؟" جواب ملا "پڑھنا ہوگا۔ اور کیا کرنا ہوگا۔" یہ خوشی سے آمادہ ہو گئے۔ چار روپے مہینہ وظیفہ مقرر ہوا۔ انھوں نے خود داخلہ لیا اور اپنے بھائی کو بھی داخل کرا دیا۔

---

[1] عہد جاہلیت کے عرب شعرا کے قصائد کا ایک مجموعہ جو سبعہ معلقہ کہلاتا ہے۔

نذیر احمد کالج کی عربی جماعت میں داخل ہوئے۔ اس زمانے میں سید احمد خاں فارسی کی جماعت میں، منشی ذکاءاللہ حساب کی جماعت میں اور پیارے لال انگریزی کی جماعت میں زیرِ تعلیم تھے۔ اب سکون سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا تو تیز رفتاری سے ترقی کی منزلیں طے کرنے لگے۔ کہا کرتے تھے "ایک تو شوق دوسرے پڑھانے والے ہشیار، تیسرے ایک مضمون اور وہ بھی ایسا جس کا مجھے بچپن سے شوق تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اپنی جماعت والوں میں سب کو دبالیا۔"

کالج میں داخلے کو کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ دونوں بھائیوں کو آٹھ روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ اسی قلیل رقم میں اپنی گزر کرنی تھی اور اسی سے اپنے خاندان کی کفالت۔ گویا اب زندگی اور موت کا سوال درپیش تھا اور یہ واضح ہوچکا تھا کہ دنیا میں سربلند ہوکے جینا ہے تو تعلیم میں دوسروں پر سبقت لے جانی ہوگی۔ اس سلسلے میں انھوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ دہلی میں عربی کے جو عالم موجود تھے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کالج کے علاوہ دو جگہ اور تعلیم حاصل کرنے لگے۔ مقصد یہ تھا کہ کالج میں کچھ کسر رہے تو وہ اس طرح پوری ہوجائے۔

نذیر احمد اب اپنا سارا وقت مطالعے میں صرف کرنے لگے۔ جو کچھ پڑھتے اسے دہراتے اور یاد کرتے۔ اگلے دن کا سبق پہلے خود محنت کرکے نکال لیتے۔ ایک جلسے میں علی گڑھ کے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔

> "دن کا تو کیا حساب دوں، مجھے یاد نہیں کہ زمانۂ طالب علمی میں کسی ایک رات نیند بھر کے سویا ہوں۔ ایک چوکیدار کو چند پیسے مہینہ دیا کرتا تھا کہ مجھ کو رات کے دو بجے کتاب بینی کے لیے جگا دے۔ میں گرمیوں میں مکان کے اندر گھٹ کر اور جاڑوں میں باہر صحن میں بیٹھ کر کتاب دیکھتا تھا کہ سو نہ جاؤں۔"[1]

---

[1] لکچروں کا مجموعہ، جلد اوّل، صفحہ ۴۳۱۔

اس محنت کا یہ نتیجہ نکلا کہ تعلیم میں ترقی ہوتی گئی اور وظیفہ بھی اوپر کی جماعت میں پہنچتے پہنچتے چار سے بڑھ کر چوبیس روپے مہینہ ہوگیا۔ کچھ روپے وہ کتابوں کے پروف پڑھ کر کما لیتے تھے اور کوئی استاد رخصت پر ہوتا تو اس کی جگہ عوضی کر لیتے۔ اس طرح انھوں نے مالی دشواریوں پر بڑی حد تک قابو پالیا تھا۔

دلّی کالج میں داخلہ لینے کے بعد نذیر احمد نے مسجد کی رہائش ترک کر دی تھی۔ اور اُسی محلّے میں ایک کوٹھری کرائے پر لے کے رہتے تھے۔ نزدیک ہی مولوی غلام حسین رہتے تھے۔ یہ مولوی عبدالخالق کے دور کے رشتے دار تھے۔ انھیں اپنے بیٹے احمد حسین کو فارسی پڑھانے کے لیے ایک استاد کی تلاش تھی۔ نذیر احمد نے یہ ذمہ داری قبول کر لی اور کچھ دن بعد مولوی غلام حسین کے کہنے سے ان کے کارچوب کے کارخانے کی ایک کوٹھری میں رہنے لگے اور انھیں کے گھر کھانا کھانے لگے۔ وہ کھانے کے تین روپے مہینہ دیا کرتے تھے اور خوش تھے کہ اب ان کا سارا وقت پڑھنے پڑھانے میں صرف ہوتا ہے۔

شادی

نذیر احمد کی شادی کا قصّہ بھی کچھ کم دل چسپ نہیں۔ جس کارخانے میں ان کی رہائش تھی وہاں ایک کاری گر برکت اللہ بھی کام کرتا تھا۔ وہ اپنی شادی کے رقعے اِدھر اُدھر بھیجا کرتا تھا۔ یہ رقعے وہ اکثر نذیر احمد سے لکھوایا کرتا تھا۔ نذیر احمد شوخ طبیعت تو تھے ہی، ایک رقعے میں برکت اللہ کی جگہ اپنا نام لکھ دیا اور لڑکی والوں کی طرف سے چھان بین ہونے لگی۔ بات مولوی غلام حسین تک پہنچی۔ انھوں نے نذیر احمد سے کہا کہ شادی کا ارادہ تھا تو مجھ سے کہہ دیتے یہ شرمندہ ہو کے چپ ہو گئے اور مولوی صاحب نے شادی کی بات چلا دی۔ نذیر احمد کو اس وقت اندازہ ہوا جب ہونے والی سسرال سے تحفے آنے لگے اور آخر کار ایک دن درزی انگرکھے کی فیروزی بانات لیے ناپ کے واسطے آپہنچا۔

مولوی عبدالخالق جو مسجد میں نذیر احمد کے استاد تھے ان کے بیٹے مولوی عبدالقادر تھے۔ نذیر احمد کا رشتہ ان کی بیٹی سے طے پایا تھا۔ یہ وہی شوخ و شریر لڑکی تھی جو چند ہی برس پہلے نذیر احمد کو طرح طرح سے ستا چکی تھی۔ اس کے باپ اور دادا دونوں نے دیکھ لیا تھا کہ اس لڑکے کے سامنے ایک روشن مستقبل ہے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ تعلیم سے فراغت کے بعد انھیں بھی درس و تدریس کے کام کے لیے مسجد میں بٹھالیں گے۔ غرض شادی ہوگئی اور مفتی صدرالدین آزردہ نے نکاح پڑھایا۔ نذیر احمد کی والدہ اس رشتے کے خلاف تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ نذیر احمد تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اپنے گھر کے حالات درست کریں اور اپنے خاندان میں ہی شادی کریں۔ انھوں نے آخر وقت تک اس رشتے کو دل سے قبول نہیں کیا۔

نکاح سے پہلے مولوی عبدالقادر نے نذیر احمد سے ایک اقرار نامہ لکھوالیا تھا کہ وہ مولوی صاحب کی بیٹی کو کہیں پردیس نہ لے جائیں گے اور اس کے جیتے جی دوسری شادی نہ کریں گے۔ نکاح سے پہلے ایک شرط نذیر احمد نے بھی رکھی کہ وہ اپنی بیوی کا کل خرچ خود اٹھائیں گے۔ مولوی عبدالقادر آسودہ حال آدمی تھے اور انھیں خانہ داماد بنا کے اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتے تھے مگر یہ ان کی غیرت کو گوارا نہ تھا۔ آخر بڑی ردو قدح کے بعد طے پایا کہ نذیر احمد مع اپنی بیوی کے سسرال میں رہیں گے اور دونوں کے کھانے کے تین روپے ماہوار دیں گے۔ یہ رقم نذیر احمد کے خیال میں بہت کم تھی خاص طور پر اس لیے کہ مولوی صاحب کے ہاں بہت اچھا کھانا کھایا جاتا تھا۔ چنانچہ نذیر احمد کے سامنے کھانا آتا تو وہ صرف دال چپاتی پر قناعت کرتے اور اچھے کھانوں کو ہاتھ نہ لگاتے نہ انھیں یہ پسند تھا کہ تہوار کے موقعے پر سسرال کی طرف سے پوشاک تیار ہو۔ ان باتوں کے سبب گھر میں اکثر تلخی رہتی تھی لیکن یہ صورت حال عارضی تھی۔ مالی حالات بہتر ہوئے تو گھر کا ماحول بھی خوشگوار ہوگیا۔

ملازمت

دلّی کالج میں نذیر احمد کی تعلیم ۱۸۴۵ء میں شروع ہوکر ۱۸۵۴ء میں تکمیل کو پہنچی۔ حقیقت یہ ہے کہ انھیں زبردست مصنف، شعلہ بیان مقرر، جیّد عالم اور شمس العلما، ڈپٹی، مولوی نذیر احمد ایل ایل ڈی اسی کالج کی تعلیم نے بنایا اور انھوں نے ہمیشہ اس کالج کو شکرگزاری کے ساتھ یاد کیا۔ ایک تقریر میں کہا تھا:۔

"اگر میں کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو میں بتاؤں کیا ہوتا۔ تنگ خیال، متعصب، اکھل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متجسس، برخود غلط مسلمانوں کا نادان دوست، تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا بہرا ..."

ابھی کالج کی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی کہ نذیر احمد کو ملازمت کی فکر دامن گیر ہوگئی اور جب تکمیل کا وقت بالکل نزدیک آپہنچا تو اس کی سبیل بھی پیدا ہوگئی۔ ضلع گجرات (پنجاب) میں مدارس قایم ہونے کی تجویز ہوئی تو دلّی کالج سے چھ استاد طلب کیے گئے۔ یہاں استادوں کی پہلے ہی کمی تھی۔ آخر ان ہونہار طالب علموں پر نظر پڑی جن کی تعلیم مکمل ہونے والی تھی۔ نذیر احمد بھی امیدوار تھے اور کالج کے ذہین طلبہ میں ان کا شمار تھا اس لیے انھیں کامل یقین تھا کہ میں ضرور منتخب ہوجاؤں گا لیکن سعی سفارش نے کام کیا اور ان کا انتخاب نہ ہوسکا۔ اس ناکامی سے انھیں بڑا صدمہ پہنچا۔ آخر قسمت نے یاوری کی۔ ایک منتخب امیدوار علالت کے سبب آدھے راستے سے واپس آئے اور ان کی جگہ نذیر احمد جو اپنی تعلیم مکمل کرکے مولوی نذیر احمد ہوگئے تھے منتخب ہوئے۔ ہم بھی آئندہ انھیں مولوی صاحب کے نام سے ہی یاد کریں گے۔

مولوی صاحب پنجاب کے تکلیف دہ سفر پر روانہ ہوگئے اور منزلِ مقصود پر پہنچ کر کنجاہ کے مدرسے میں چالیس روپے ماہوار پر مدرس مقرر ہوئے۔ اجنبی ماحول، نامانوس زبان اور اس سے بڑھ کر یہ کہ گھوم گھوم کے بچوں کو اکٹھا کرو اور انھیں الف بے پڑھاؤ۔ اس لیے یہاں ان کا دل

نہیں لگا اور ملازمت کے لیے اِدھر اُدھر درخواستیں بھیجنے لگے۔ آخر دو جگہ سے ملازمت کی پیش کش ہوئی۔ اجمیر کالج سے سو روپے ماہوار پر عربی مدرسی کی اور کان پور سے اسّی روپے ماہوار پر ڈپٹی انسپکٹر مدارس کی۔ انھوں نے دوسری ملازمت کو پسند کیا اور ابھی دو برس پورے نہ ہوئے تھے کہ وہ پنجاب کی ملازمت ترک کر کے دہلی ہوتے ہوئے کان پور پہنچے اور نئی ذمہ داری سنبھال لی۔ کپتان فلر یہاں انسپکٹر مدارس تھے۔ ان سے مولوی صاحب کی نباہ نہ ہوئی آخر استعفیٰ دے دیا۔ اس اثنا میں، ۱۸۵۷ء کی بغاوت رونما ہوئی اور مولوی صاحب بہ ہزار دقت دہلی پہنچے۔

مولوی صاحب دہلی پہنچے تو سارے شہر میں قتل و غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ اس زمانے کے کئی واقعات مرزا فرحت اللہ بیگ نے مولوی صاحب کی زبان سے سنے تھے۔ اس کا کچھ حصہ مرزا صاحب کی مختصر کتاب میں محفوظ رہ گیا ہے۔ ایک بار مولوی صاحب نے یہ قصہ سنایا کہ "ایک روز میں دریبے[1] میں سے جا رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک فوج کی فوج تلنگوں کی آ رہی ہے۔ میں بھی دبک کر گلاب گندھی کی دُکان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ آگے آگے بینڈ والے تھے مگر وہ ایسا اندھا دھند ڈھول ٹھونک رہے تھے کہ خدا کی پناہ۔ پیچھے کوئی پچاس ساٹھ سوار تھے مگر ان کی عجیب کیفیت تھی۔ گھوڑے کیا تھے دھوبی کے گدھے معلوم ہوتے تھے، بیچ میں سوار تھے مگر گٹھریوں کی کثرت سے جسم کا کچھ تھوڑا ہی سا حصہ دکھائی دیتا تھا۔ یہ گٹھریاں کیا تھیں، دہلی کی لوٹ۔ جس بھلے آدمی کو کھاتا پیتا دیکھا اس کے کپڑے تک اتروا لیے، جس پیسے والے کو دیکھا اس کے گھر پر جا کر ڈھئی دے دی اور کہا چل ہمارے ساتھ قلعے کو، تو انگریزوں سے ملا ہوا ہے۔ جب تک کچھ رکھوا نہ لیا اس کا پنڈ نہ چھوڑا۔ اگر دہلی کے چاروں طرف انگریزی فوج کا محاصرہ نہ ہوتا تو شریف لوگ کبھی کے دہلی سے نکل گئے ہوتے۔

غرض خدائی فوجداروں کا یہ لشکر غل مچاتا، دین دین کے نعرے لگاتا میرے سامنے سے

---

[1] دہلی کی جامع مسجد سے ملحق ایک بازار

گزرا۔ اس جمِ غفیر کے بیچوں بیچ دولھا میاں تھے۔ یہ کون تھے عالی جناب بہادر خاں صاحب سپہ سالار لباس سے بجائے سپہ سالار کے دولھا معلوم ہوتے تھے جڑاؤ زیور میں لدے ہوئے تھے۔ پہنتے وقت شاید یہ بھی معلوم کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی گئی تھی کہ کون سا مردانہ زیور ہے اور کون سا زنانہ۔ صافے پر بجائے طرّے کے سراسری لگائی گئی تھی۔ جیسے خود زیور سے آراستہ تھے اسی طرح ان کا گھوڑا بھی زیور میں لدا ہوا تھا۔ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھے جاتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ نعوذ باللہ خدا کی خدائی اب ان کے ہاتھ آگئی ہے۔ گلاب گندھی نے جوان لٹیروں کو آتے دیکھا چپکے سے دکان بند کردی اور اندر درزوں سے بیٹھا جھانکتا رہا۔ خدا معلوم کیا اتفاق ہوا کہ بہادر خاں کا گھوڑا عین اس کی دکان کے سامنے آکر رکا۔ بہادر خاں نے اِدھر اُدھر گردن پھیری۔ پوچھا 'یہ کس کی دکان ہے'؟ ان کے ایڈی کانگ نے عرض کی 'گلاب گندھی کی'۔ فرمایا 'اس بدمعاش کو خبر نہیں تھی کہ مابدولت اِدھر سے گزر رہے ہیں۔ دکان بند کرنے کے کیا معنی۔ ابھی کھُلواؤ'۔

خبر نہیں اس حکمِ قضا شیم کا بچارے لالہ جی پر اندر کیا اثر ہوا۔ ہم نے تو یہ دیکھا کہ ایک سپاہی نے تلوار کا دستہ کواڑ پر مار کر کہا کہ دروازہ کھولو اور جس طرح سم سم کھُل جا کے الفاظ سے علی بابا کے قصّے میں چوروں کے خزانے کا دروازہ کھلتا تھا اسی طرح اس کے حکمِ محکم سے گلاب گندھی کی دکان کھُل گئی۔ بجنسہٖ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تماشے کا پردہ اٹھ گیا۔ دروازے کے بیچوں بیچ لالہ جی کانپتے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ کچھ بولنا چاہتے تھے مگر زبان یاری نہ دیتی تھی۔ اس وقت بہادر خاں کچھ خوش خوش تھے۔ شاید کسی موٹی اسامی کو مار کر آئے تھے۔ کہنے لگے "تمھاری دکان ہی سے بادشاہ کے ہاں عطر جاتا ہے؟" لالہ جی نے بڑے زور سے گردن کو ٹوٹی ہوئی گڑیا کی طرح جھٹکا دیا۔ حکم ہوا کہ جو عطر بہتر سے بہتر ہو وہ حاضر کرو۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے اندر گئے اور دو کنٹر عطر سے بھرے ہوئے حاضر کیے۔ معلوم نہیں بیس روپے تولہ کا عطر تھا یا تیس روپے تولہ کا۔ بہادر خاں نے دونوں کنٹر لیے۔ کاگ نکالنے کی تکلیف کون گوارا کرتا۔ ایک کی گردن دوسری سے ٹکرادی۔ دونوں گردنیں کھٹ سے ٹوٹ گئیں۔ عطر سونگھا۔ کچھ پسند آیا۔ ایک کنٹر گھوڑے کی

ایال پر الٹ دیا اور دوسرا دُم پر۔ کنٹر پھینک حکم دیا 'فارورڈ' اور اس طرح بچارے گلاب گندھی کا سیکڑوں روپے کا نقصان کر کے یہ ہندوستان کو آزادی دلانے والے چل دیے۔ اِدھر اس خدائی فوجدار کا جانا، ادھر ہم لونڈوں کا تالیاں بجانا۔ بچارے لالہ جی نے کھسیانے ہو کر دکان بند کر دی۔" [1]

مرزا فرحت اللہ بیگ نے مولوی صاحب کی زبانی سنا ہوا اسی طرح کا ایک اور افسوسناک قصہ لکھا ہے۔ بولے "کالج کی دوربین کو توڑ کر جو نقصان اس بے سری فوج نے اس ملک کو پہنچایا اس کی تلافی ناممکن ہے۔ کالج میں پرنسپل صاحب کے کمرے کے اوپر ایک بڑی زبردست دوربین نصب تھی۔ پرنسپل صاحب کہا کرتے تھے کہ یہ دوربین کالج کے ایک بڑے دلدادہ انگریز نے کالج کی نذر کی تھی۔ اس کا سامنے کا شیشہ بڑی دقت سے تیار ہوا تھا۔ اس انگریز کے خاندان والوں نے برسوں میں اسے گھس کر پتلا اور اتنا پتلا کیا تھا کہ کاغذ سے بھی باریک ہو گیا تھا۔ غرض کہ یہ دوربین کالج کا سرمایۂ ناز تھی۔ دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوٹھے پر ایک بڑی توپ لگی ہوئی ہے۔ کسی نے جا کر فوج میں اڑا دیا کہ انگریزوں نے راتوں رات کشمیری دروازے سے آ کر کالج کے اوپر توپ لگا دی ہے اور اب تھوڑی دیر میں قلعہ اڑا دیں گے۔ یہ سننا تھا کہ فوج کالج پر چڑھ آئی۔ سیڑھیاں لگا کر سیکڑوں سپاہی چھت پر پہنچ گئے۔ ایک کندۂ ناتراش نے بندوق کا کندہ سامنے کے شیشے پر مارا۔ چھن سے شیشے کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اور ایک خاندان کی پچاس ساٹھ برس کی محنت خاک میں مل گئی۔ انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، دوربین کی دوربین اٹھا نیچے پھینک دی اور چند منٹ کے اندر دین دین کے نعروں میں اس یادگار سلف کا خاتمہ ہو گیا۔" [2]

مولوی صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ جب تک دہلی پر باغیوں کا قبضہ رہا وہ لوٹ مار کرتے رہے اور جب انگریز فوجوں کا قبضہ ہو گیا تو انھوں نے ظلم میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ مولوی صاحب

---

[1] نذیر احمد کی کہانی... ۶۴

[2] " " " ۶۳

اور ان کی سسرال کو اس قیامت کے دوران بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سارا خاندان گھر چھوڑ کے ادھر اُدھر سر چھپاتا پھرا۔ اس میں انگریز سپاہیوں کے ہاتھوں قید بھی ہوئے۔ وہ تو اس خاندان نے ایک انگریز خاتون کی جان بچائی تھی اس لیے رعایت برتی گئی ورنہ سب جان سے مارے گئے ہوتے۔ اسی زمانے میں مولوی صاحب کی بیوی کا سارا زیور بھی لٹ گیا۔

دوسری ملازمت

ابھی پوری طرح ملک میں امن و امان قایم نہ ہوا تھا کہ مولوی صاحب الہ آباد میں مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر مقرر ہوئے۔ وہ لمبا سفر طے کر کے الہ آباد پہنچے لیکن یہاں تعلیم کا سارا نظام درہم برہم تھا۔ کچھ دن انتظار کرتے رہے آخر کار یہ نئی ذمہ داری سنبھالی مگر یہاں بھی دل نہ لگا۔ مولوی صاحب ابھی تک انگریزی سے ناواقف تھے۔ دراصل ان کے والد نہیں چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا انگریزی پڑھ کے گنہگار ہو۔ انھوں نے کہہ دیا تھا "مجھے اس کا مرجانا منظور، اس کا بھیک مانگنا قبول مگر انگریزی پڑھنا گوارا نہیں۔" الہ آباد میں مولوی صاحب کا قیام امینِ عدالت عبداللہ خاں کے مکان پر تھا۔ ان کے سمجھانے پر مولوی صاحب نے انہی صاحب سے انگریزی سیکھنی شروع کی اور جلد ہی معمولی انگریزی سیکھ گئے۔ بعد کو دو انگریزوں سے بھی استفادہ کیا۔ ان میں سے ایک مسٹر لوَ تھے جو سر ولیم میور کے داماد اور سکریٹری تھے اور بعد کو بلند شہر کے کلکٹر ہو گئے تھے۔ مولوی صاحب نے ان سے جو کچھ سیکھا وہ خط و کتابت کے ذریعے۔ دوسرے ایک پادری ریورنڈ اسکلٹن سے جو اعظم گڑھ میں مقیم تھے۔ مولوی صاحب نے ان سے توریت پڑھی تھی۔

اُردو تراجم

مولوی صاحب الہ آباد ہی میں تھے کہ انکم ٹیکس ایکٹ جاری ہوا اور اس کے اردو ترجمے

کی ضرورت محسوس کی گئی۔ سر ولیم میور جو آئندہ صوبہ متحدہ (موجودہ اتر پردیش) کے لفٹیننٹ گورنر ہوئے اس زمانے میں ریونیو بورڈ کے سینیر ممبر تھے۔ انھوں نے الہ آباد کے ایک ڈپٹی کلکٹر میر ناصر علی خاں سے اس ضرورت کا ذکر کیا۔ انھوں نے اس کام کے لیے مولوی صاحب کا نام پیش کر دیا۔ وہ اس کام کے لیے آمادہ تو نہ تھے لیکن یہ ذمہ داری آ ہی پڑی تو کوشش کی کہ ترجمے کا حق ادا کر دیں۔ محنتی اور فرض شناس تو تھے ہی، سوا روپے کی رایل ڈکشنری خرید لائے اور اس کی مدد سے کام شروع کر دیا۔ ولیم میور کو ترجمہ پسند آیا۔ انھوں نے مولوی صاحب کے افسر بابو شیو پرشاد کو ہدایت کر دی کہ نذیر احمد کو کام سے سبکدوش کر دیا جائے تاکہ وہ ترجمے کا کام مکمل کر سکیں۔ بابو جی تند مزاج تھے اور مولوی صاحب کی ان سے بنتی نہیں تھی۔ مولوی صاحب کو خوشی ہوئی کہ ان کی ماتحتی سے نجات ملی اور انھیں ملال ہوا کہ ایک ماتحت کی حکام بالا تک رسائی ہو گئی۔ آخر کوشش کر کے بابو جی بھی ترجمے کے کام میں شریک ہو گئے اور وہ بھی مولوی صاحب کے حاکم کی حیثیت سے۔ اس سے مولوی صاحب بہت بد دل ہوئے اور ترجمے کے کام میں رکاوٹ پیدا ہوئی لیکن آخر کار کام مکمل ہو گیا اور مولوی صاحب نے محسوس کر لیا کہ ان میں ترجمے کی اچھی صلاحیت موجود ہے۔

ابھی مولوی صاحب بابو شیو پرشاد کی ماتحتی میں کام کر رہے تھے کہ انڈین پینل کوڈ کے اردو ترجمے کا آغاز ہوا اور اس کے لیے مترجمین کی ایک جماعت تعینات کر دی گئی۔ مسٹر ریڈ ڈائرکٹر تعلیمات اس کی اصلاح پر مامور ہوئے۔ کچھ دنوں کے لیے یہ کام مولوی صاحب کے سپرد ہوا کہ ڈائرکٹر صاحب کو ترجمہ پڑھ کر سنا دیا کریں۔ وہ اس ترجمے سے مطمئن نہ تھے، اکثر جھنجلاتے۔ ایک دن مولوی صاحب نے کچھ دفعات کا خود بھی ترجمہ کیا اور ڈائرکٹر صاحب کو سنانا چاہا۔ انھوں نے کہا "تم تو انگریزی نہیں جانتے۔ تم ترجمہ کیسے کر سکتے ہو؟" انھوں نے کہا "میں نے رائل ڈکشنری کی مدد سے ترجمہ کیا ہے" اس پر وہ مسکرائے اور بولے "انڈین پینل کوڈ کا ترجمہ رائل ڈکشنری کی مدد سے نہیں ہو سکتا۔" انھوں نے عرض کیا کہ سن تو لیجیے۔ انھوں نے سنا اور بہت خوش ہوئے۔

آخر مولوی صاحب بھی مترجمین میں شامل کیے گئے اور اندازہ یہ ہے کہ وہی شریک غالب رہے۔ اس طرح انڈین پینل کوڈ کا ترجمہ تعزیراتِ ہند بھی ان کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

نئی ملازمت

اس ترجمے کے انعام میں مولوی صاحب کو ڈپٹی کلکٹر نامزد کیا گیا لیکن فوری طور پر ان کو تحصیلداری ملی۔ وہ دو برس یعنی ۱۸۶۱ء اور ۱۸۶۲ء میں کان پور اور گورکھپور میں تحصیلدار رہے۔ تقرر کے تین چار مہینے کے اندر ہی انھوں نے تحصیلداری کا امتحان پاس کر لیا اور اس میں اوّل رہے۔ اس ملازمت کے دوران انھوں نے ضابطہ فوجداری کے ترجمے پر نظرثانی کی۔

۱۸۶۳ء میں مولوی صاحب ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ انھوں نے ڈپٹی کلکٹری کا امتحان بھی پاس کیا اور اس میں بھی اوّل رہے۔ مولوی صاحب کچھ عرصے گورکھپور میں رہے۔ پھر جالون کو تبادلہ ہوا۔ آخر ترقی پا کر پھر گورکھپور لوٹ آئے۔ یہاں ان کی ملاقات مسٹر پیورون، مہتمم بندوبست سے ہوئی۔ وہ مولوی صاحب کی علمیت کے بڑے قدردان تھے۔ انھوں نے مولوی صاحب سے اپنے ایک مضمون (مقدمۂ قانونِ شہادت) کا ترجمہ بھی کرایا تھا۔

کچھ دنوں بعد مولوی صاحب کا تبادلہ اعظم گڑھ کو ہو گیا۔ اُس وقت مسٹر پیورون نے یہ اشتہار شایع کرایا کہ ہیئت پر کول مین کی کتاب "ہیونز" کا ترجمہ مطلوب ہے۔ سب سے بہتر ترجمہ کرنے والے کو ایک ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔ پیورون کے اصرار پر مولوی صاحب نے بھی ترجمہ کیا۔ کُل گیارہ ترجمے موصول ہوئے۔ بہترین ترجمے کا انتخاب کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس نے مولوی صاحب کے ترجمے کو سب سے بہتر قرار دیا لیکن یہ بھی کہا کہ اس میں خامیاں موجود ہیں اور مترجم ایک ہزار کا نہیں بلکہ صرف چار سو کا مستحق ہے۔ مولوی صاحب نے اسے ناانصافی سمجھا اور اس فیصلے پر بہت ملول ہوئے۔

ریاست حیدر آباد کے نواب رفیع الدین خاں، امیر کبیر علم ہندسہ اور علم ہیئت کے ماہر

تھے۔ مسٹر لیورون کی خواہش تھی کہ وہ بیونٹر کے ترجمے "سماوات" پر نظر ثانی کردیں۔ ان کی یہ خواہش مسٹر سانڈرس ریذیڈنٹ ریاست حیدرآباد کے ذریعے امیر کبیر تک پہنچی اور انھوں نے سرسالار جنگ کے ذریعے نظر ثانی کا کام مولوی سید حسین بلگرامی کے سپرد کیا۔ بلگرامی صاحب نے ترجمے کو پسند کیا اور مشورہ دیا کہ مترجم خود ایک بار اس پر نظر ثانی کرے۔ اس رپورٹ کے نتیجے میں ایک ہزار کا انعام تو مولوی صاحب کو مل ہی گیا لیکن یہ ترجمہ ہی مولوی صاحب کی ملازمتِ حیدرآباد کا وسیلہ بھی بنا۔

ملازمتِ حیدرآباد

مولوی صاحب کی ملازمتِ حیدرآباد کے سلسلے میں تین قیاس آرائیاں کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مولوی صاحب کے ترجمے "سماوات" نے سرسالار جنگ کو متوجہ کیا اور مولوی سید حسین بلگرامی کے ذریعے ملازمت کی پیش کش مولوی صاحب تک پہنچی۔ دوسری یہ کہ محسن الملک کی کوشش سے یہ ملازمت عطا ہوئی اور تیسری قیاس آرائی یہ ہے کہ سرسید کی سفارش سے مولوی صاحب کو یہ ملازمت ملی۔ یہ بات قرینِ قیاس نہیں کہ ایک مختصر سا ترجمہ اتنی بڑی ملازمت کی بنیاد قرار پائے۔ گمان غالب یہ ہے کہ مولوی صاحب کی ملازمت سرسید کی سلسلہ جنبانی کا نتیجہ تھی اور محسن الملک نے انھی کے ایما پر حیدرآباد میں مولوی نذیر احمد کی ملازمت کے لیے کوشش کی۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ تنخواہ کے سلسلے میں مولوی صاحب کو ریاست حیدرآباد کے خطوط سرسید کے ذریعے ہی موصول ہوئے۔

بہرحال مولوی صاحب نے اعظم گڑھ کی ڈپٹی کلکٹری سے دو سال کی رخصت لی اور پہلی اپریل ۱۸۷۷ء کو حیدرآباد کے لیے روانہ ہو گئے۔ ۲۷/اپریل کو مولوی صاحب منزل مقصود پر پہنچے اور نواب محسن الملک کی کوٹھی پر قیام کیا۔ وہ اپنے ہمراہ اپنے داماد احمد حسن اور بہنوئی رفیع الدین کو بھی لے گئے۔ ان دونوں کو بھی مولوی صاحب کی ماتحتی میں ہی ملازمتیں دی گئیں۔ مولوی صاحب کی تنخواہ بارہ سو چالیس روپے مقرر ہوئی اور ان کے سپرد یہ کام ہوا کہ مختلف مقامات کا دورہ کرکے

دفاتر کا معائنہ کریں اور ان کی کارکردگی کی مفصل روئیداد سرکار کو پیش کریں۔ مولوی صاحب نے یہ کام بڑی محنت سے انجام دیا اور اس کے صلے میں فوراً ہی ترقی پائی یعنی ناظم بندوبست سے ناظم بندوبست و منصرم صدر تعلقہ دار ہو گئے۔ سر سالار جنگ مولوی صاحب سے اتنے متاثر تھے کہ اپنے دونوں بیٹوں کی تعلیم ان کے سپرد کی اور مولوی صاحب نے بھی حق ادا کر دیا۔ حیدر آباد میں قیام کے دوران انھوں نے کم سن سرکار نظام کی تعلیم کے لیے کچھ رسالے بھی تصنیف کیے۔

مولوی صاحب کی درخواست پر سالار جنگ نے محسن الملک کو ہدایت کی کہ مولوی صاحب کے بیٹے مولوی بشیر الدین اور بعض دوسرے عزیزوں کو مناسب ملازمتوں پر نامزد کیا جائے۔ اس حکم کی تعمیل ہوئی۔ اب مولوی صاحب برطانوی حکومت کی ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد وہ مجلس مال گزاری کے رکن یعنی ممبر ریونیو بورڈ نامزد ہوئے اور سترہ سو روپے تنخواہ مقرر ہوئی۔ مگر ریاست حیدر آباد سازشوں کا مرکز تھی۔ ارباب اختیار ہر وقت سیاسی جوڑ توڑ میں مصروف رہتے تھے۔ بیرون ریاست کے لوگ جو بسلسلۂ ملازمت وہاں مقیم تھے، ہندوستانی کہلاتے تھے اور ان کے خلاف وہاں بہت تعصب پایا جاتا تھا۔ سالار جنگ کی وفات کے بعد حالات اور بھی دگرگوں ہو گئے۔ محسن الملک سے بھی مولوی صاحب کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو گئی اور آخر کار وہ ملازمت حیدر آباد سے بددل ہو کر مستعفی ہو گئے اور دہلی لوٹ آئے۔ ان کی کارکردگی کے صلے میں چھ سو روپے مہینہ پنشن مقرر ہوئی جو آخر وقت تک ملتی رہی۔

حکومتِ برطانیہ نے ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے ۱۸۹۷ء میں شمس العلما کے خطاب سے نوازا۔ ۱۹۰۲ء میں اڈنبرا یونی ورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری عطا کی۔ آخر عمر میں فالج کا حملہ ہوا اور ۲۸ دسمبر ۱۹۱۰ء کو انھوں نے وفات پائی۔

حلیہ

نذیر احمد کا قد چھوٹا اور جسم فربہ تھا۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ جب بارہ برس کے تھے تو نو برس کے لگتے تھے۔ عمر بڑھنے اور فراغت میسر آنے کے ساتھ ساتھ فربہی میں اضافہ ہوتا گیا۔ افتخار عالم اور مرزا فرحت اللہ بیگ دونوں نے مولوی صاحب کے قلمی مرقعے پیش کیے ہیں۔ ان کے کئی فوٹو بھی دستیاب ہیں۔ یہاں ان سب کو ملا کر ایک مکمل قلمی تصویر کھینچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس تصویر میں اس زمانے کے مولوی صاحب نظر آئیں گے جب وہ حیدر آباد کی ملازمت سے پنشن لے کر دہلی میں آ رہے تھے اور گھر سے شام کو ٹہلنے کے لیے نکلتے تھے یا کسی جلسے میں تقریر کرنے کے لیے۔

مولوی صاحب بڑے وجیہہ اور بارعب انسان تھے۔ تن و توش ایسا تھا کہ دور سے لوگوں کو متوجہ کر لے۔ ترکی ٹوپی اور کشمیری کام کے جُبّے سے شخصیت کچھ اور پُر وقار لگنے لگتی تھی۔ کسی جلسے میں تقریر کرنی ہوتی تو اکثر ایل ایل ڈی کا گاؤن زیب تن ہوتا اور سر پر سفید عمامہ۔ سفید لباس پسند تھا۔ عام طور پر گھر سے سفید کُرتا پاجامہ اور سفید شیروانی پہن کر نکلتے تھے۔ جاڑوں میں کشمیرے کی اچکن پہن لیتے تھے۔ لال نری کا سلیم شاہی جوتا پسند تھا لیکن سرکاری جلسوں کے لیے انگریزی جوتے بھی گھر میں موجود تھے جن کی عمر بہت ہو گئی تھی اور جنھیں پالش سے کبھی سروکار نہ رہا تھا۔ اس لیے سوکھ کر کھڑنک ہو گئے تھے۔ جرابوں کا استعمال کم ہی کرتے تھے۔

مولوی صاحب کا رنگ سانولا تھا اور سر بالوں سے بے نیاز۔ گدی اور کنپٹیوں پر سفید بالوں کی پتلی سی جھالر تھی جسے جلدی جلدی صاف کراتے رہتے تھے۔ ناک ذرا موٹی، دہانہ کشادہ اور ٹھوڑی مضبوط تھی۔ آنکھوں کی چمک ذہانت کا پتہ دیتی تھی۔ داڑھی ایسی چھدری تھی کہ گال اور ٹھوڑی صاف نظر آتے تھے۔ قدرت نے اسے خود ہی فرنچ کٹ داڑھی بنا دیا تھا اور اس کی تراش خراش کی ضرورت کم ہی پیش آتی تھی۔ آواز ایسی گرج دار تھی کہ گفتگو کر رہے ہوں تو محفل پر اور تقریر کر رہے ہوں تو مجمعے پر چھا جاتے تھے۔ کوئی دور سے سنے تو سمجھے مولوی صاحب غصے میں کسی کو لتاڑ رہے ہیں مگر جو پاس بیٹھا ہو وہ ہنسی سے دہرا ہو ہو جائے کیونکہ مولوی صاحب کے مزاج میں ظرافت بے پناہ تھی۔ وہ اپنی گفتگو میں لطیفوں اور چٹکلوں کی پھلجھڑیاں سی چھوڑتے جاتے تھے۔

مولوی صاحب نے ہمیشہ بڑی سادہ زندگی گزاری۔ سردیوں میں عموماً روئی کا کنٹوپ بالوں سے بے نیاز سر کو ٹھنڈی ہوا سے محفوظ رکھتا تھا۔ اس کے دونوں طرف کانوں کے اوپر دو سائبان سے نکلے ہوتے تھے۔ سردی شدید اور ہوا تیز ہو تو یہ سائبان گر کے دونوں کانوں کو ڈھک لیتے تھے اور ان کے کناروں سے لٹکتی ڈوریاں ٹھوڑی کے نیچے لا کر باندھ دی جاتی تھیں۔ سردی کم ہوئی تو یہ سائبان اوپر کو اُٹھ گئے اور دونوں ڈوریاں سر کے عین اوپر لے جا کے گرہ دے دی گئی۔ جسم کو سردی سے محفوظ رکھنے کے لیے مرزئی پہنی اور اوپر سے موٹی سی چادر لپیٹ لی تخت یا فرش پر بیٹھ کے گاؤ تکیے سے کمر ٹکالی اور مطالعے میں مصروف ہو گئے۔ کچھ لکھنا ہوا تو سامنے رکھی نیچی اور چھوٹی سی تپائی کو کھینچ کے ذرا اور نزدیک کر لیا اور جھک کے کام شروع کر دیا۔ گرمی کا موسم ہے تو تکلف برطرف مولوی صاحب گھر میں تہمد باندھے بلکہ لپیٹے رہیں گے۔ تہمد میں گرہ نہ لگی ہو تو اٹھنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس لیے جب تک ممکن ہوتا مولوی صاحب اٹھنے کو ٹالتے رہتے۔ حقے کا بہت شوق تھا۔ یہ شغل ہر وقت جاری رہتا تھا۔ جتنا شوق انھیں حقہ پینے کا تھا اس سے زیادہ شوق ان کے ملازم خدا بخش کو چلمیں بھرنے کا تھا۔ ابھی آگ پوری

طرح دہکی نہیں اور چلم شباب پر آئی نہیں کہ خدا بخش لپک جھپک آئے اور چلم اٹھا کے لے گئے۔ مولوی صاحب روکتے رہ گئے مگر بہرا آدمی کیا سنے۔ ذرا میں دوبارہ چلم بھر کے آگئی۔ مولوی صاحب اسی انداز سے بیٹھے بیٹھے حقہ پیتے، یہیں ناشتہ کرتے، کھانا کھاتے، مطالعہ کرتے، تصنیف و تالیف کا کام کرتے اور شاگردوں کو پڑھاتے۔ کبھی کبھار کوئی معزز ملاقاتی بھی آجاتا۔ اس سے ملاقات بھی اسی کمرے اور اسی لباس میں ہوتی۔

●

عادات وخصائل

مولوی نذیر احمد کے تمام علمی و ادبی کارناموں پر نظر ڈالی جائے اور پھر اس مختصر سے ذخیرے کا جائزہ لیا جائے جو ان کی حیات و تصانیف کے سلسلے میں اب تک وجود میں آیا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ وہ بہت ملنسار آدمی تھے، ساری اردو دنیا ان کا لوہا مانتی تھی اور ملک میں ان کے قدر دانوں کی کمی نہ تھی۔ ان میں اکثر اہلِ قلم تھے۔ اگر ان میں سے چند نے بھی مولوی صاحب کے حالات اور عادات و اطوار پر قلم اٹھایا ہوتا تو ان کی شخصیت پوری طرح اُبھر کر آج ہمارے سامنے آئی ہوتی۔ بہرحال افتخار عالم کی ضخیم کتاب اور فرحت اللہ بیگ کے ایک مضمون اور خود مولوی صاحب کے قلم سے نکلے ہوئے ہزاروں صفحات کا مطالعہ کیجیے تو ان کے عادات و خصائل کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوجاتا ہے۔ ان ذرائع سے جو معلومات ہمیں فراہم ہوسکی اس کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:-

علم کا شوق

نذیر احمد کو بچپن سے علم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ اورنگ آبادی مسجد میں قیام کے دوران کون سی تکلیف تھی جو انھیں برداشت نہ کرنی پڑی لیکن یہ علم کا شوق ہی تھا کہ انھوں نے ساری اذیتیں ہنسی خوشی جھیل لیں۔ مسجد کے مولوی صاحب کے گھر خادم کا کام کیا، سودا سلف لاکے دیا، سیروں مسالا پیسا اور ان کی پوتی سے مار کھائی۔ دلّی کالج میں داخلہ ہوگیا تو کالج کے

علاوہ دو عالموں سے پڑھنے کا بندوبست کیا۔ ملازمت کے دوران انگریزی، تلنگی اور سنسکرت سیکھی۔ قرآن شریف حفظ کیا۔ ان کے نزدیک علم کی کیا اہمیت تھی اس کا اندازہ ان خطوں سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے بیٹے بشیر الدین کو لکھے ہیں۔ انھیں بار بار لکھا ہے کہ تمھاری جو بھی فرمائش ہو اس کے پورا کرنے کو میں موجود ہوں اور اس کے بدلے میری تم سے صرف ایک ہی فرمائش ہے کہ جی لگا کے پڑھو۔ انھوں نے خطوط کے ذریعے اپنے بیٹے کو انگریزی تلفظ اور عربی قواعد کے رموز و نکات سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان کے مسائل پر انھیں کیسا عبور حاصل تھا۔

تنگدستی کے زمانے میں نذیر احمد کو کوئی کتاب دستیاب ہو جاتی تو مسجد کے سنگی فرش پر کہنیاں ٹکائے گھنٹوں اس کے مطالعے میں غرق رہتے۔ خود کہا کرتے تھے کہ مطالعے کی چاٹ ایک بار لگ جائے تو جیتے جی چھوٹتی نہیں۔ ان کا یہ شوق آخر وقت تک کم نہیں ہوا۔ جسے پڑھنے کا شوق ہو اسے پڑھانے میں بھی لطف آتا ہے۔ عمر کے آخری حصے میں بھی طالب علموں کو پڑھانے کے لیے ایک وقت مقرر تھا۔ "مولوی نذیر احمد کی کہانی ..." کے مصنف مرزا فرحت اللہ بیگ اور ان کے ایک دوست غلام یزدانی نے مولوی صاحب سے عربی پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ عدیم الفرصت تھے۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ گرمیوں میں دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر قیلولہ کر لیتے ہیں اور سردیوں میں فجر کی نماز کے بعد ذرا دیر کو سو لیتے ہیں، ان دونوں عادتوں کو خیرباد کہہ کے انھیں پڑھائیں گے مگر چھٹی کسی دن نہ ہوگی۔ استاد کے ساتھ شاگردوں کی ہمت پر بھی آفریں ہے کہ گرمیوں کی دوپہر اور سردیوں کے تڑکے میں دو میل کا سفر پیدل طے کر کے پڑھنے جاتے تھے اور کمال یہ کہ چار برس کے قریب پڑھا مگر ایک دن کی چھٹی نہ کی۔ علم کی پیاس جیسی نذیر احمد کو تھی کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جیسی ترقی انھوں نے کی اس کی مثال بھی مشکل ہی سے ملتی ہے۔

جفاکشی

مولوی نذیر احمد کی زندگی جفاکشی کی ایک طویل اور مسلسل داستان ہے۔ کم عمری میں والد کی سرپرستی سے محروم ہو گئے تھے اور کنبے کی ذمہ داری کا بوجھ سر پر آپڑا تھا۔ چنانچہ طالب علمی کے زمانے سے ہی سخت محنت کرنی پڑی۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ مطبعے کی کتابوں کی کاپیاں درست کر کے کچھ کما لیتے تھے۔ چھوٹی جماعتوں کے استاد رخصت پر جاتے تو کبھی کبھی عیوضی پر ان کا تقرر ہو جاتا اور اس طرح کچھ آمدنی ہو جاتی۔ یہ ان کی بے پناہ محنت ہی کا ثمرہ تھا کہ بہت سی پریشانیوں اور مالی الجھنوں کے باوجود وہ تعلیم میں اپنے ہم جماعتوں سے سبقت لے گئے۔ حیدرآباد میں مولوی صاحب نے اتنی محنت سے کام کیا اور ایسی فرض شناسی کا ثبوت دیا کہ ریاست کے عہدیداروں میں بہت جلد ممتاز ہو گئے۔ ان کی بلند پایہ تصانیف بھی ان کی جفاکشی کی گواہ ہیں۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی آرام کے بجائے انھوں نے اپنا تمام وقت علمی مشاغل میں صرف کیا اور وہ بھی اس طرح کہ مشغولیت انھیں آرام کی مہلت نہ دیتی تھی۔

وقت کی پابندی

مولوی صاحب وقت کے بہت پابند تھے اور ان کی کامیابی میں اس پابندیِ وقت کو بہت دخل تھا۔ جن دنوں مرزا فرحت اللہ بیگ اور غلام یزدانی کو دوپہر میں پڑھاتے تھے تو کھانے کے بعد اچھی طرح آرام نہ کر پاتے تھے کہ گھنٹہ ٹن سے ڈیڑھ بجاتا اور یہ کل کی مشین کی طرح اٹھ بیٹھتے۔ شاگرد بھی ایسے علم کے دیوانے تھے کہ وقت سے دس پانچ منٹ پہلے سے آکے دروازے میں چپ چاپ کھڑے ہو جاتے۔ مولوی صاحب کا معمول تھا کہ آندھی جائے مینہ جائے لیکن شام کے ٹھیک چھ بجے دہلی ٹاؤن ہال کی لائبریری میں ضرور جاتے تھے اور ایسی پابندی سے وہاں پہنچتے تھے کہ گھڑی ملالو۔ اگر چپراسی سے کوئی پوچھتا کہ ابھی مولوی صاحب نہیں آئے

تو وہ گھڑی دیکھ کر جواب دیتا "بس اب آنے ہی والے ہیں۔ چھ بجنے میں دو ہی منٹ تو باقی ہیں۔"
وقت کی پابندی کا ساری زندگی یہی حال رہا۔ ہمیشہ ان کے ہر کام کا وقت مقرر رہا اور انھوں نے پوری طرح اس کی پابندی کی۔

مشرقی وضع

مولوی صاحب کا مزاج خالص مشرقی تھا۔ مغربی تہذیب جب ہندوستان میں اپنی بساط بچھا رہی تھی وہ ان کی نوعمری کا زمانہ تھا۔ اوروں کی طرح وہ بھی اس نئی تہذیب کے دلدادہ ہو جاتے تو کیا عجب تھا، خاص طور پر اس لیے کہ وہ دہلی کالج میں تعلیم پاتے تھے مگر وہ مشرقی وضع پر فدا تھے اور ساری زندگی اسی پر کاربند رہے۔ وہ انگریزی لباس اور رہن سہن دونوں کو تکلیف دہ سمجھتے تھے۔ حیدرآباد میں نواب محسن الملک نے ان کی کوٹھی کو زبردستی انگریزی فرنیچر سے آراستہ کرا دیا لیکن جیسے ہی موقع ملا انھوں نے اس فرنیچر سے نجات پالی اور پھر اپنی پرانی روش پر آ گئے۔ ان کے کمرے میں عموماً ایک چارپائی ہوتی تھی اور ایک تخت۔ یہ دو چیزیں ان کی تمام ضرورتوں کو کافی تھیں۔ فرحت اللہ بیگ نے مولوی صاحب کے آخری ایام کا حال بیان کیا ہے جس سے ان کے لباس اور طرز رہائش کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے کمرے میں آرام کرنے کے لیے ایک پلنگ اور نشست کے لیے فرش کافی تھا۔ لباس کا معاملہ یہ تھا کہ گرمی کے موسم میں تہمد باندھے بلکہ باندھے کیا، لپیٹے رہتے تھے۔ سردیوں میں شال اور کنٹوپ کا اضافہ ہو جاتا تھا۔

یہی نہیں کہ مولوی صاحب مشرقی وضع کے دلدادہ تھے، وہ مغربی لباس اور مغربی رہن سہن کو تکلیف دہ اور مضحکہ خیز خیال کرتے تھے۔ ہندوستان کے لاٹ پادری لارڈ لیفرائے کے روبرو ایک تقریر میں انھوں نے کہا تھا:

> "حضرات پیجامہ اچھا ہے یا پتلون، ہم پرانے آدمی تو موسم کے لحاظ سے اٹھنے بیٹھنے کی سہولت و آرام کے لحاظ سے پیجامے ہی کو اچھا کہیں گے مگر آج کل

کے ہندوستانی صاحب بہادر پتلون کا ساتھ دیں گے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ یہ انگریزوں کا پہناوا ہے۔ ہم اچکن یا انگرکھے کو اچھا کہیں گے کہ اس سے ستر ڈھکتا ہے، آدمی بھاری بھرکم معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے یورپ کے بھائی کوٹ کو پسند کریں گے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ یہ انگریزوں کا پہناوا ہے۔ ہم بڈھے سلیم شاہی جوتی پر جان دیں گے کیونکہ اس میں پیر کو آرام ملتا ہے۔ نرم نرم اور سبک ہوتی ہے۔ ہمارے فیشن کے عاشق فل بوٹ کا انتخاب کریں گے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ یہ انگریزوں کا پہناوا ہے۔ ہمارے پاس اپنی پرانی ہر چیز کے لیے اچھے ہونے کا ثبوت موجود ہے۔ ان کے پاس صرف ایک جواب ہے کہ یورپ والے ایسا ہی پہنتے ہیں اور بھئی ہے بھی یہی بات۔ قسمت نے ہم کو انگریزوں کا ماتحت کر دیا ہے۔"

بیباکی و صاف گوئی

بیباکی اور صاف گوئی شروع ہی سے نذیر احمد کی سرشت میں داخل تھیں۔ وہ کبھی صاف اور سچی بات کہنے سے نہ چوکتے تھے۔ یہ واقعہ پیچھے بیان کیا جا چکا کہ ایک عجیب اتفاق کے تحت دلّی کالج کے پرنسپل نے انھیں زبانی امتحان کے لیے مفتی صدرالدین آزردہ کے روبرو پیش کر دیا۔ اپنی عادت کے مطابق مفتی صاحب نے نذیر احمد کو 'تو' کہہ کے مخاطب کیا۔ نذیر احمد نے کہا 'میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جو آپ مجھے اس طرح مخاطب کر رہے ہیں؟'

نذیر احمد کی شادی ایک آسودہ حال گھرانے میں ہوئی تھی لیکن سسرال کی امارت انھیں کبھی مرعوب نہ کر سکی۔ انھوں نے ہمیشہ خودداری کا دامن تھامے رکھا اور کبھی سسرال کے دست نگر نہ ہوئے بلکہ عزت نفس انھیں اکثر ایسا رویہ اختیار کرنے پر مجبور کرتی تھی کہ سسرال کے لوگ انھیں چڑچڑا اور بددماغ خیال کر کے ملول ہوتے تھے۔

نذیر احمد کو بڑی دشواریاں اٹھانے کے بعد ملازمت ملی تھی۔ جب وہ کانپور کے محکمہ تعلیم میں کپتان فلر کے ماتحت کام کر رہے تھے تو ایک دن کپتان صاحب نے ان سے سخت کلامی کی۔ یہ بھلا تو ہین کب برداشت کر سکتے تھے۔ فوراً استعفیٰ دیا اور دہلی روانہ ہو گئے۔ یہی صورت حیدر آباد میں پیش آئی۔ خوشامد اور جی حضوری ان کے بس کی نہ تھی۔ اس کے بغیر وہاں گزارا مشکل تھا۔ حالات کو ناسازگار پایا تو ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔

ایک بار وائسرائے ہند لارڈ کرزن نے اہل ہند کو نصیحت کی کہ ہندوستانی سچ چھوڑو، انگریزی سچ بولا کرو۔ مولوی صاحب کو یہ بات ناگوار گزری۔ آخر ایک دن دل کا بخار نکالنے کا موقع مل ہی گیا۔ وائسرائے کے روبرو انھوں نے ایک تقریر میں کہا:۔

"انھوں نے یہ سمجھا ہے کہ یہاں کے سچ اور یورپ کے سچ میں فرق ہے اور وقت آگیا ہے کہ پیجامے کی طرح ہندوستانی سچ کو اتار کر پھینک دیا جائے اور پتلون کی طرح ولایتی سچ پہن لیا جائے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان کے کسی مذہب نے سچ کی تلقین ہی نہیں کی ہے اور یہ نیا مال دساور ہو کر ولایت سے آیا ہے۔ بہرحال کچھ بھی ہو۔ اب تمھارے پرانے سچ کی قدر نہیں رہی ہے۔ خدا کے لیے اگر اپنا بھلا چاہتے ہو تو ان لاٹ صاحبوں کا حکم مانو۔ یہ بڑے لوگ ہیں، مولوی نذیر حسین یا پنڈت بانکے لال نہیں ہیں کہ انھوں نے ہندوستانی سچ بولنے کی ہدایت کی اور تم ہنس کر ٹال گئے۔ لاٹ صاحب کی بات نہ مانو گے اور ولایتی سچ نہ بولو گے اور یہ تازہ مال استعمال نہ کرو گے تو یاد رکھو کہ نوکری ملنی مشکل ہو جائے گی اور نوکری نہ ملی تو روٹیوں کو محتاج ہو جاؤ گے۔"

ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی نذیر احمد کی جرأت مندی اور صاف گوئی ابتدائے عمر سے آخر وقت تک برقرار رہی اور انھوں نے دب کر حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا۔

روپیہ کمانے کا شوق

انھوں نے بہت برے دن دیکھے تھے اور عمر کا ایک حصّہ گداگری میں بسر کیا تھا۔ جب قسمت ان پر مہربان ہوئی اور لکشمی نے ان کے دروازے پر دستک دی تو انھوں نے گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔ روپیہ کمانے کا کوئی موقع انھوں نے ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ زمانہ طالب علمی میں کتابت کی تصحیح کرکے اور عیوضی ملازمت کرکے انھوں نے اپنے وظیفے کی قلیل آمدنی میں اضافہ کیا۔ جب انھیں اندازہ ہوا کہ تصنیفی کام مزید آمدنی کا ذریعہ ہوسکتا ہے تو وہ کتابیں لکھنے پر کمربستہ ہوگئے۔ ان کی آمدنی معقول تھی اور اخراجات محدود۔ اس لیے کچھ نہ کچھ پس انداز بھی کر لیتے تھے۔ تنخواہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ بچت کی رقم میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ جب ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو ان کے پاس دس لاکھ سے زیادہ زرِ نقد تھا۔ ذرا سوچیے اُس زمانے کے لحاظ سے یہ رقم کتنی بڑی تھی۔ مگر اس رقم کا بڑا حصّہ برباد ہوگیا۔ کچھ قرض میں ڈوبا، کچھ تجارت کے شوق میں۔

مولوی صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ مسلمان تجارت کی طرف متوجہ ہوں۔ اس مقصد کے لیے وہ کسی بھی خواہش مند کو بڑی سے بڑی رقم دے دیتے تھے اور منافع میں اپنا حصّہ مقرر کر لیتے تھے۔ ان میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جن کا مقصد تجارت کرنا نہیں مولوی صاحب کو دھوکا دینا تھا۔ اگر کسی نے نقصان دکھا دیا تو مولوی صاحب الٹی ڈھارس بندھاتے تھے کہ تجارت میں تو یہ ہوتا ہی ہے۔ انھوں نے خود بھی تجارت کی۔ مطبع کھولا اور پریس قایم کیا۔ اس کام میں بھی بہت نقصان ہوا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے لکھا ہے کہ مولوی صاحب سود لینے کو جائز سمجھتے تھے اور خود انھیں سود پر روپیہ قرض دینا چاہتے تھے۔ اوّل تو کسی اور ذریعے سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی دوسرے یہ کہ زندگی بھر کبھی مولوی صاحب کا رویّہ سود خوروں کا سا نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں لاکھوں روپے سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ممکن ہے سود کی شرط رکھ کے وہ مرزا کی ضرورت کو آزماتے ہوں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مرزا قرض لوٹاتے تو مولوی صاحب اصل لے کر سود واپس

کر دیتے۔ یہ بات ہم اس بنیاد پر عرض کرتے ہیں کہ خود مولوی صاحب کو ان کے ایک کرم فرما نے اسی طرح فضول خرچی سے بچنے اور پس انداز کرنے کا شوق دلایا تھا۔ انھوں نے قرض کے نام سے رقم لی اور ایک عرصے تک واپس نہ کی۔ اس عرصے میں مولوی صاحب نے بہت تکلیف اٹھائی اور ان سے بدگمان بھی ہو گئے۔ ایک مدّت بعد یہ عقدہ کھلا کہ انھوں نے تو قرض لیتے ہی ان کے نام سے پرامزری نوٹ خرید لیے تھے اور یوں پس انداز کرنے کا راستہ دکھایا تھا۔ مولوی صاحب مرزا کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ ممکن ہے وہ اپنا شوق ان میں بھی پیدا کرنا چاہتے ہوں۔ بہرحال یہ طے ہے کہ روپیہ کمانے اور جمع کرنے کا انھیں شوق تھا اور اس شوق میں وہ دوسروں کو بھی شریک کرنا چاہتے تھے۔

ظرافت

مولوی صاحب کے مزاج میں ظرافت بے پناہ تھی۔ وہ ہنس مکھ ہی نہیں ہنسوڑ تھے اور ہر بات میں مذاق کا پہلو نکال لیتے تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے لکھا ہے کہ متانت انھیں چھو نہیں گئی تھی۔ انھوں نے یہ دل چسپ واقعہ بیان کیا ہے کہ مولوی صاحب کے حقے کا نیچہ اتنا پرانا ہو گیا تھا کہ اس کے تیار ہونے کی تاریخ لوگوں کے دلوں سے محو ہو چکی تھی۔ بعض دوستوں نے اسے بدلنے کی تجویز پیش کی تو مولوی صاحب نے نیچے کو جورو کا مرادف قرار دے کر ایسا سخت فقرہ کسا کہ بیچارے ٹھنڈے ہو گئے۔ اسی باب میں مولوی صاحب کی ایک تقریر کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس تقریر میں انھوں نے ہندوستانی لباس کا مغربی لباس سے اور ہندوستانی سچ کا انگریزی سچ سے مقابلہ کیا ہے۔ یہ تقریر اُن کے طنز اور ظرافت دونوں کا بہترین نمونہ ہے۔

۱۹۰۳ء کا واقعہ ہے کہ دہلی میں اجمیری دروازے کے باہر ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ مولوی صاحب نے مدّت ہوئی لکچر دینا چھوڑ دیا تھا مگر اس میں لکچر دینے کو آمادہ ہو گئے۔ یہ خبر

سن کے ایک خلقت ٹوٹ پڑی۔ لارڈ کچنر نے اطلاع کرائی کہ میں بھی آج کے لکچر میں شریک ہوں گا۔ محسن الملک جلسے کے منتظم تھے۔ وہ پہلے تو ان کے استقبال کی تیاری میں پنڈال کے اندر باہر آتے جاتے رہے۔ پھر یہ ہوا کہ باہر ذرا گڑبڑ ہوئی اور محسن الملک نے سمجھا کہ معزز مہمان آ گئے۔ وہ اٹھ کے فوراً باہر جاتے اور پھر آ بیٹھتے۔ مولوی صاحب کو یہ بات ناگوار ہوئی۔ انھوں نے ٹوکا بھی مگر محسن الملک پر اثر نہ ہوا۔ آخر کار لارڈ کچنر آ پہنچے۔ محسن الملک نے معزز حاضرین سے ان کا تعارف کرایا۔ مولوی صاحب نے اپنا تعارف آپ کرایا۔ فرحت اللہ بیگ نے لکھا ہے کہ لارڈ کچنر بولے "مولوی صاحب، ہم نے کورس میں آپ کی کتابیں پڑھی ہیں۔ آج آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی" مولوی صاحب نے جواب دیا "اور سب سے بڑی خوشی یہ ہوئی کہ آپ کی وجہ سے ایک معمہ حل ہو گیا... ہمارے ہاں قیامت کی نشانیوں میں لکھا ہے کہ اس وقت ایسا تہلکہ ہو گا کہ حاملہ عورتوں کے حمل گر جائیں گے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ ایسی کیا مصیبت ہو گی کہ حمل گرا دے گی مگر آج یقین آ گیا کہ جو کچھ لکھا ہے صحیح لکھا ہے۔ جب آپ کی آمد نے بڑے بڑے پیٹ والے بڈھوں کے حمل گرا دیے تو کیا تعجب ہے کہ قیامت کی آمد عورتوں کے حمل گرا دے" اس بھرپور طنز سے سارے ہال میں سناٹا چھا گیا۔

حاضر دماغی

مولوی صاحب بہت ذہین اور حاضر دماغ تھے۔ یہ ذہانت ہی تھی جس کے سہارے انھوں نے ترقی کی منزلیں طے کیں۔ مولوی صاحب کی زندگی کے بے شمار واقعات سے ان کے ذہن کی براقی کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن یہاں ہم صرف ایک واقعے کا ذکر کریں گے۔ ایک بار امیر حبیب اللہ خاں دہلی آئے۔ عید کا دن تھا اور اتفاق سے جمعہ بھی تھا۔ انھوں نے نماز جمعہ کے بعد سرکٹ ہاؤس میں دربار کیا۔ جو مشاہیر دربار میں موجود تھے ان میں ایک مولوی نذیر احمد بھی تھے۔ سر ہنری میک موہن نے تعارف کرایا۔ جب مولوی صاحب کا نمبر آیا تو امیر نے کہا "آپ کو

ان کا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ان کی تصانیف بہت شوق سے پڑھتا ہوں اور تقریباً سب کا ترجمہ کرا چکا ہوں۔ دیکھنے کا اشتیاق تھا وہ آج پورا ہوگیا" پھر پوچھا "مولوی صاحب آپ شعر بھی کہتے ہیں؟" انھوں نے کہا "جی ہاں، کہتا ہوں لیکن آج آپ کی تعریف میں کسی اور کا شعر پڑھوں گا۔" یہ کہہ کر متنبّی کا عربی شعر پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ آج جمعہ ہے، عید ہے اور کیوں نہ ہو۔ آج عید اور حبیب دونوں جمع ہیں۔ یہ شعر لطف دے گیا۔ وہ دن جمعہ کا بھی تھا اور عید کا بھی اور حبیب یعنی امیر حبیب اللہ خاں بھی موجود تھے۔ یہ شعر سن کے وہ ایسے بے قابو ہوئے کہ بے اختیار اٹھ کے مولوی صاحب سے بغل گیر ہو گئے اور ان کا منہ چوم لیا۔

●

ناول نگاری

اُردو ادب پر مولوی نذیر احمد کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اردو کا پہلا ناول انہی کے قلم سے وجود میں آیا اور دل چسپ بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کی ناول نگاری کوئی شعوری کوشش نہیں تھی بلکہ محض حسن اتفاق تھی۔ ان اتفاقات نے نذیر احمد کی داستانِ حیات کو ایسا پُر لطف بنا دیا ہے کہ پڑھیے اور حظ اُٹھائیے۔ پنجابیوں کے کٹڑے کی مسجد میں رہتے اور تعلیم پاتے تھے تو حکم ہوا کہ روز بلا ناغہ مولوی عبدالقادر کے گھر حاضری دو اور جو خدمت سپرد ہو بجا لاؤ۔ یہ سودا سلف لا کے دیتے، مصالحہ پیستے تب کہیں جا کے سوکھی روٹی اور باسی سالن ملتا اور کبھی وہ بھی نہ ملتا مگر ان کی شوخ و شریر بیٹی کے ہاتھوں پٹائی روز لگتی۔ آخر ایک دن وہی ان کی شریک حیات بنی۔ دلّی کالج گئے تھے تماشا دیکھنے لیکن قدرت کو منظور تھا کہ وہاں سے عالم ہو کر نکلیں۔ نہ وہاں پھسل کے گرتے، نہ پرنسپل صاحب دل جوئی کے لیے سوال جواب کرتے نہ وہاں داخلہ ہوتا۔ سماوات کے ترجمے پر کمیٹی کی رائے موافق ہوتی تو اسے نظر ثانی کے لیے ریاست حیدر آباد کیوں بھیجا جاتا اور وہاں ان کی شاندار ملازمت کے لیے راستہ کیسے ہموار ہوتا۔ غرض ان کی زندگی میں ایسے واقعات پیش آئے جو حقیقت کم اور کہانی زیادہ لگتے ہیں۔ ان کی ناول نگاری بھی ایسا ہی ایک واقعہ ہے۔

مولوی صاحب ضلع جالون میں ڈپٹی کلکٹر تھے تو انھیں خیال آیا کہ دونوں بیٹیاں اور بیٹا پڑھنے کے قابل ہو گئے، اب اس طرف توجہ کرنی چاہیے۔ تبادلے کی نوکری تھی، آج یہاں کل

وہاں اس لیے یہ بات دل میں پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ جس طرح ان کے والد نے انھیں پڑھایا تھا اُسی طرح وہ خود اپنے بچوں کو تعلیم دیں گے۔ اب جو مسئلہ سب سے پہلے سامنے آیا وہ تھا کتابوں کا انتخاب۔ اردو میں ایسی کتابیں ناپید تھیں جو مفید ہونے کے ساتھ ساتھ دل چسپ بھی ہوں۔ مولوی صاحب مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر رہ چکے تھے۔ انھیں خوب اندازہ تھا کہ اردو میں چھوٹے بچوں کے جتنے قاعدے موجود ہیں اور جتنی کتابیں دستیاب ہیں ان سے بچوں کے دل افسردہ اور ذہن کُند ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے بچوں کے لیے کتابیں بھی خود ہی تیار کریں گے۔ اور فوراً ہی اس فیصلے پر عمل بھی شروع ہو گیا۔

اُردو کا پہلا ناول

مولوی صاحب نے اپنی بڑی بیٹی سکینہ کے لیے کتاب لکھنی شروع کی اور وہ اس طرح کہ دو چار صفحے لکھ کر اسے دے دیتے۔ چار پانچ روز میں جب وہ یہ صفحات پڑھ چکتی تو آگے کو لکھ دیتے۔ انھوں نے کتاب کا پورا منصوبہ تو پہلے سے تیار نہیں کیا تھا البتہ یہ طے کر لیا تھا کہ کتاب سبق آموز بھی ہو اور بے حد دل چسپ بھی۔ اس لیے قصّے کا انداز اختیار کیا۔ پہلے ایک لڑکی اکبری کا قصّہ لکھا جسے ماں اور نانی کے لاڈ پیار نے بالکل نکما کر دیا تھا۔ وہ بہت ضدّی، بدمزاج، بے ادب اور بدسلیقہ تھی۔ کسی سے اس کی نباہ نہ ہوتی تھی۔ اس کے شوہر محمد عاقل نے اسے سُدھارنے کی جتنی تدبیریں کیں رائیگاں گئیں اور سب کی زندگی تلخ ہو گئی۔

اکبری کے قصّے میں درمیانی طبقے کے مسلم گھرانے کی ایسی ہو بہو تصویر کھنچ گئی اور ایسی دل چسپی کا سامان فراہم ہو گیا کہ مولوی صاحب کی بیٹی سکینہ نے اسے بہت تیزی کے ساتھ پڑھ ڈالا بلکہ اس کے تقاضے نے ہی اکبری کا قصّہ مکمّل کرایا تھا۔ اس کے بعد اصغری کا قصّہ شروع ہوا۔ یہ اپنی بڑی بہن کی ضد تھی ــــ باادب، خوش مزاج اور سلیقہ شعار۔ اس

نے شادی کے بعد اپنے گھر کو جنّت کا نمونہ بنا دیا۔

اس کتاب کو بڑی بیٹی کے بعد مولوی صاحب کی چھوٹی بیٹی نے، پھر پاس پڑوس کی عورتوں نے پڑھا۔ جو پڑھ نہ سکتی تھیں انھوں نے سنا۔ بہتوں نے اس کی نقلیں لیں جو دور دور پہنچیں۔ اس طرح امور خانہ داری اور لڑکیوں کی تربیت کے موضوع پر ایک دل چسپ اصلاحی ناول مراۃ العروس تیار ہوگیا۔ یہ بات ۱۸۶۸ء کی ہے اس کتاب کے ساتھ ہی مولوی صاحب نے اپنی چھوٹی بیٹی کے لیے "منتخب الحکایات" اور اپنے بیٹے بشیر الدّین کے لیے "چند پند" دو کتابیں تیار کیں۔ پہلی کتاب میں سبق آموز حکایتیں اور دوسری میں مختلف عنوانات کے تحت نصیحت آمیز باتیں ہیں۔ یہ کتابیں ۱۸۶۹ء میں مکمل ہوئیں۔ یہاں یہ قصّہ بھی سننے کے لائق ہے کہ کس طرح مراۃ العروس کے شایع ہو کر شہرت پانے کی آپ سے آپ سبیل پیدا ہوگئی۔

مراۃ العروس کی اشاعت

ایک بار مسٹر کمپسن ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن دورہ کرتے ہوتے جالون پہنچے۔ مولوی صاحب کی رہائش گاہ کے نزدیک ہی ان کا کیمپ لگا۔ اتفاق دیکھیے میاں بشیر گھومنے نکلے تو ڈائرکٹر صاحب سے سامنا ہوگیا۔ انھوں نے ادب سے سلام کیا۔ انھوں نے اخلاقاً نام پوچھا۔ پھر پوچھا "کس کے بیٹے ہو؟" انھوں نے باپ کا نام بتایا۔ انھوں نے دو ایک سوال اور کیے اور یہ بھی پوچھا کہ "کیا پڑھتے ہو؟" انھوں نے کہا "چند پند"۔ اس پر ڈائرکٹر صاحب چونکے کہ یہ نیا نام تھا۔ کہا "ہمیں اپنی کتاب دکھاؤ گے؟" انھوں نے جواب دیا "ابھی لاتا ہوں۔ کیا آپا کی کتاب مراۃ العروس بھی لاؤں؟" یہ دوسرا نیا نام تھا، بولے "وہ بھی ضرور لاؤ"۔ میاں بشیر نے گھر جا کے اپنے جزودان میں سے "چند پند" نکالی۔ پھر بہن کے بستے میں سے "مراۃ العروس" نکالی تو وہ پیچھے دوڑی۔ بشیر جیت گئے اور کتاب لے کے باہر بھاگے۔ بہن روتی رہ گئی۔ ڈائرکٹر صاحب نے دونوں کتابیں اُلٹ پلٹ کے دیکھیں

اور یہ کہہ کے ساتھ لے گئے کہ اگلے دن لوٹا دیں گے۔ اب میاں بشیر کو اندازہ ہوا کہ غلطی ہوگئی۔ شام کو مولوی صاحب گھر آئے تو دیکھا سکینہ نے رو رو کے بُرا حال کر لیا ہے اور بشیر چور بنے کونے میں سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ بیٹی کو دلاسا دیا کہ اور کتاب لکھ دیں گے لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ کتابیں ڈائرکٹر صاحب لے گئے ہیں تو کس مقصد سے۔

اگلے دن ڈائرکٹر صاحب نے مولوی صاحب کو یاد کیا۔ مراۃ العروس کی بہت تعریف کی اور اسے شایع کرانے کا مشورہ دیا۔ حکومت نے اس کتاب پر ایک ہزار روپے انعام دیا اور دو ہزار جلدیں خریدیں۔ ۱۹۶۹ء میں یہ کتاب شایع ہوئی اور اس پر شاندار تبصرے ہوئے۔ اسے زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ پے در پے اس کے ایڈیشن شایع ہوتے۔ عام لوگوں نے اسے اکبری اصغری کے قصّے کے نام سے یاد کیا بلکہ مصنّف کا نام بھی اکبری اصغری والے مولوی صاحب مشہور ہوگیا۔

بنات النعش

مراۃ العروس کے تین برس بعد یعنی ۱۸۷۲ء میں بنات النعش شائع ہوئی۔ اس کا موضوع بھی تعلیم اخلاق اور تربیت خانہ داری ہے۔ اسے ایک طرح مراۃ العروس کا حصّہ دوم بھی کہا جا سکتا ہے۔ پہلے ناول میں دکھایا گیا ہے کہ اصغری خانم نے تعلیم نسواں کو عام کرنے کے لیے ایک مدرسہ قایم کیا تھا۔ حسن آرا جو بنات النعش کا مرکزی کردار ہے اسی اسکول میں تعلیم پاتی ہے۔ تعلیم حاصل کرنے سے پہلے وہ بہت خودسر، بدزبان اور بدسلیقہ لڑکی تھی۔ معلومات عامّہ کے معاملے میں وہ بالکل صفر تھی لیکن اصغری نے اس کی کایا پلٹ دی۔ باتوں باتوں میں اسے دنیا بھر کی معلومات ازبر کرا دیں۔ علم جغرافیہ، تاریخ، جغرافیہ، موسموں کی تبدیلی، زمین کی گردش، ہوا کا دباؤ، خوردبین، زمین کا گول ہونا۔ کون سی چیز ہے جو اسے نہ سکھا دی گئی ہو۔ یہاں واقعات کے بجائے معلومات پر زیادہ زور ہے۔ مولوی صاحب نے یہ کتاب بھی سرکار کو پیش کی اور اس پر پانچ سو

روپیہ انعام پایا۔

توبۃ النصوح

۱۸۷۷ء میں مولوی نذیر احمد کا تیسرا ناول توبۃ النصوح شائع ہوا۔ پلاٹ، کردار نگاری، مکالمے اور زبان و بیان ہر لحاظ سے یہ بہت دل چسپ ناول ہے اور اکثر امتحانات کے نصاب میں داخل ہے۔ اس ناول کا موضوع ہے تربیتِ اولاد۔ مصنف نے یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ اولاد کی پرورش کے ساتھ ساتھ ان کی بہترین تربیت بھی والدین کی ذمہ داری ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کو ایسا نمونہ بنائیں جو اولاد کے لیے قابلِ تقلید ہو۔ مولوی صاحب یہ ناول ہندو مسلمان سب کے لیے لکھنا چاہتے تھے لیکن بقول خود ان کے کسی ایک خاندان کا انتخاب تو کرنا ہی تھا۔ چنانچہ ایک مسلمان گھرانے کا انتخاب کیا لیکن باقی تمام چیزیں ایسی ہیں کہ مسلمانوں کی جگہ ہندوؤں کی رکھ دو تب بھی کوئی فرق نہ پڑے مثلاً نماز کی جگہ پوجا پاٹ کر دو، روزے کے بجائے برت، خیرات و زکوٰۃ کی جگہ دان پُن لکھ دو۔ اس بیان سے مولانا کی وسعتِ قلب کا اندازہ ہوتا ہے۔

قصہ یوں ہے کہ ہیضے کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ اہل شہر پر ہراس طاری ہے۔ نصوح کے خاندان میں تین موتیں ہو چکی ہے۔ وہ خود بھی بیمار پڑتا ہے اور ڈاکٹر اسے نیند کی دوا دیتا ہے۔ موت کا خوف عالمِ خواب میں روزِ حشر کا نقشہ پیش کر دیتا ہے۔ آنکھ کھلتی ہے تو وہ خدا کا شکر بجالاتا ہے کہ جو کچھ دیکھا خواب تھا حقیقت نہ تھی۔ یہ خواب اس کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیتا ہے اور وہ طے کر لیتا ہے کہ بہر حال اپنے خاندان کی اصلاح کرے گا۔ بیوی بچے کہنے پر عمل کرتے ہیں مگر ایک بیٹے کلیم کی عادتیں پختہ ہو گئی ہیں۔ وہ کسی طرح راہِ راست پر نہیں آتا بلکہ لڑ جھگڑ کے اپنے ایک دوست مرزا ظاہر دار بیگ کے گھر چلا جاتا ہے۔ اس شخص کے ہاں ظاہر داری اور مکر و فریب کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہاں شرمندگی اٹھانی

پڑتی ہے۔ آخر فوج میں بھرتی ہو کے زخمی ہوتا ہے اور مرجاتا ہے لیکن سدھرتا نہیں۔
نصوح، کلیم اور ظاہر دار بیگ اس ناول کے مرکزی کردار ہیں جن کے گرد ساری کہانی گھومتی ہے۔ انداز بیان ایسا دل چسپ ہے کہ قاری کی دل چسپی شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں میں اسے سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

فسانۂ مبتلا

یہ مولوی نذیر احمد کا چوتھا ناول ہے۔ جو ۱۸۸۵ء میں شایع ہوا۔ اس کا ایک نام 'محصنات' بھی ہے۔ تعدد ازدواج اس کا موضوع ہے یعنی یہ واضح کیا گیا ہے کہ ایک سے زیادہ شادیاں کرنا ہر لحاظ سے بُرا ہے۔ اس موضوع کو نہایت پرکشش ناول کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ ضمناً یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اولاد کی تربیت سے غفلت کے نتائج بُرے ہوتے ہیں اور اچھی صحبت میسّر نہ آئے تو بچوں کی زندگی برباد ہو جاتی ہے۔

مبتلا اس ناول کا ہیرو ہے۔ اس کے باپ کی خواہش تھی کہ اسے مدرسے میں تعلیم دلائے مگر ماں کو اس کی جدائی گوارا نہ تھی اس لیے گھر کی چار دیواری ہی میں ایک مولوی کے ذریعے تعلیم کا آغاز ہوا۔ ماں کے لاڈ پیار نے طبیعت میں بگاڑ پیدا کیا۔ پھر جب مدرسے میں داخل ہوا تو بدچلن لڑکوں سے دوستی ہوئی۔ ماں اس کے عیبوں پر پردہ ڈالتی تھی اس لیے کسی عیب کی اصلاح نہ ہو سکی۔ باپ نے یہ سوچ کر شادی کی زنجیر پیروں میں ڈال دی کہ شاید اسی طرح بے راہ روی کم ہو مگر اس میں برابر اضافہ ہی ہوا۔ باپ کے مرنے کے بعد تو وہ بالکل ہی کھُل کھیلا۔ مردانہ مکان ناچ رنگ، بہروپ اور مجرے کا مرکز بنا۔ اُدھر لکھنؤ کی ایک خانگی ہریالی نے لکھنؤ سے آکر اسی محلّے میں بود و باش اختیار کی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ مبتلا کی اس سے ملاقات نہ ہوتی، ملاقات ہوئی اور راہ و رسم یہاں تک بڑھی کہ مبتلا نے اس سے دوسرا نکاح کر لیا۔ مبتلا ہریالی کو ماما کے بھیس میں گھر لایا۔ کچھ دنوں تک راز راز رہا پھر پردہ فاش ہو گیا۔ ستونوں

میں گالم گلوچ اور مار پٹائی ہوئی۔ سارے محلّے نے تماشا دیکھا۔ دوسری بیوی آمید سے ہوئی تو پہلی نے اسے زہر دلوا دیا مگر وہ بچ گئی۔ بات تھانے کچہری تک پہنچی تو پہلی بیوی نے خوف سے افیون کھالی۔ مبتلا کی ایسی درگت بنی کہ دونوں بیویوں سے کنارہ کر لیا اور اس کی حالت بڑی عبرتناک ہوگئی۔ تھوڑے ہی دنوں میں ہریالی تکلیفیں اٹھا اٹھا کے مرگئی اور آخر کار یہی انجام مبتلا کا ہوا۔ اس کی موت اس لیے اور بھی دردناک تھی کہ کنبے والا تھا مگر مرتے وقت کوئی منہ میں پانی چوانے والا نہ تھا۔ مبتلا کی موت کے بعد اس کے چچا وعظ کہتے ہیں اور اس میں تعدد ازدواج کی خرابی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ کتاب کے آخر میں مبتلا کا مرثیہ ہے۔ جو اس مصرع پر ختم ہوتا ہے ع

دو بیبیاں نہ کیجو زنہار بھول کر

ابن الوقت

یہ بھی مولوی نذیر احمد کا بہت مقبول ناول ہے۔ جب وہ حیدر آباد سے پنشن لے کر دہلی آئے تو زیادہ انہماک کے ساتھ علمی کاموں کی طرف متوجہ ہوئے۔ اسی زمانے میں یہ ناول تصنیف ہو کر ۱۸۸۸ء میں شایع ہوا۔ یہ ایک معاشرتی ناول ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ جو لوگ آدابِ معاشرت میں دوسری قوموں کی نقل کرتے ہیں وہ نہ اِدھر کے رہتے ہیں اور نہ اُدھر کے اور ایک نہ ایک دن انھیں شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔ مولوی نذیر احمد نے وہ زمانہ پایا جب ایک تہذیب مٹتی جا رہی تھی اور دوسری تہذیب کے خط و خال ابھی پوری طرح نمودار نہ ہوئے تھے گویا پرانے ستارے ایک ایک کر کے ٹوٹتے جا رہے تھے اور نئے ابھی طلوع نہ ہوئے تھے۔ نئی تہذیب کی چکا چوند نے بہت سی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا اور ہندوستانیوں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آگیا تھا جو آدابِ معاشرت یعنی لباس، رہن سہن اور عادات و اطوار میں نئے حاکموں کی نقالی کرتا تھا۔ مولوی نذیر احمد اُونچے اُونچے عہدوں پر رہے، بڑے بڑے انگریز افسروں کے ساتھ نشست و برخاست رہی مگر انھوں نے

نہ تو انگریزی لباس کو اپنایا اور نہ انگریزی طرز تمدن کو بلکہ جس نے اپنایا اُسے ناپسند کیا۔ اس ناول میں ایسے ہی لوگوں کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

اس ناول کے ہیرو ابن الوقت نے اپنی پرانی وضع کو چھوڑ کے انگریزی وضع کو اختیار کر لیا۔ لباس انگریزی اور وہ بھی ایسے کہ ٹہلنے کا لباس الگ، ملاقات کرنے کا لباس دوسرا، کچہری جانے کا لباس تیسرا، کھانا کھانے کا لباس چوتھا۔ اسی طرح کھانے انگریزی اور کھانا کھانے کا انداز بھی انگریزی کہ میز پر بیٹھو اور چھری کانٹے سے کھاؤ۔ انگریزوں کی نقل میں انہی کی سی سواریاں رکھیں۔ انگریزوں کے خادم وردی پہنتے تھے۔ انھوں نے بھی اپنے ملازموں کی ویسی ہی وردیاں تیار کرائیں۔ اپنا گھر چھوڑ کے کرایے کا بنگلہ لیا اور اسے انگریزی بنگلوں کی طرح آراستہ کیا انگریزوں کی ریس میں بہت سے کتے پالے۔ لیکن جلد ہی زندگی دوبھر ہوگئی۔ آمدنی معقول تھی مگر اب وہ ایسی ناکافی ہوئی کہ قرض کا بوجھ بڑھنے لگا۔ ساری چھاؤنی میں ابن الوقت کے باورچی کی دھوم تھی کہ اس سے اچھے انگریزی کھانے کوئی اور ہندوستانی باورچی نہیں تیار کر سکتا مگر اس کے تیار کیے ہوئے بے مزہ کھانوں سے ابن الوقت کا پیٹ نہیں بھرتا تھا۔ اسے راتوں کو خواب میں چٹپٹے ہندوستانی کھانے یاد آتے تھے۔ پھر بھی وہ اس طرح کی باتیں سوچ سوچ کر خوش تھا کہ صاحب لوگ مجھے ڈنر پر بلاتے ہیں، کونسل کے ممبر نے مجھے خط لکھا، کمشنر صاحب نے مجھ سے ایک سرکلر کا مسودہ تیار کرایا، مس جوزفا کو میرے کتے بہت پسند ہیں، ایک میم نے ولایت سے لکھا ہے کہ اپنا فوٹو بھیج دو، اس دن میجر صاحب نے آئس کریم جمانے کے لیے میرے ملازم کو بلایا۔

ابن الوقت بہت دنوں ایسی ہی بچکانہ باتوں سے اپنے دل کو بہلاتا رہا۔ اس کے بھائی حجۃ الاسلام نے بحث کر کے قائل کر دیا کہ یہ راستہ غلط ہے مگر وہ باز نہ آیا اور اپنے مذہب سے بھی دور ہوتا چلا گیا۔ آخر کار اپنی قوم کے لوگ بیزار ہو گئے۔ لطف یہ کہ انگریز جن کی پیروی میں اپنی یہ درگت بنائی تھی وہ بھی اس کی بناوٹی روش کو ناپسند کرنے

لگے اور انجام کار اسے اپنے کیے پر پچھتانا پڑا۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مولوی صاحب نے ابن الوقت کے پردے میں سرسید کو طنز کا نشانہ بنایا ہے کیوں کہ انھوں نے انگریزی طرز معاشرت کو اختیار کر لیا تھا۔ سید افتخار عالم نے لکھا ہے سرسید کے بیٹے سید محمود مولوی صاحب سے خفا تھے کہ انھوں نے سرسید کا مذاق اڑایا۔ مولوی صاحب کا جواب تھا کہ "میں نے تو انگریزی وضع کے مقلدوں کو ملاحی گالیاں دی ہیں جو چاہے گالیاں اپنے اوپر لے لے"[1] مولوی صاحب کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سرسید کا دل سے احترام کرتے تھے اور ان کے اصلاحی مشن میں ہمیشہ معاون رہے۔ سرسید کی موت کا انھیں ایسا صدمہ تھا کہ لکچر دینے چھوڑ دیے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ قوم میں بحث مباحثے اور لکچر کی داغ بیل مرحوم نے ڈالی تھی اور اب کوئی تقریر کو کہتا ہے تو ان کی یاد آجاتی ہے اور زبان ساتھ نہیں دیتی۔ اس ناول میں مولوی صاحب نے انگریزی تہذیب کے مقلدوں پر ایک عام اعتراض کیا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس آئینے میں سرسید کی بھی ایک ہلکی سی جھلک ضرور نظر آجاتی ہے۔

ایامیٰ

یہ ناول ۱۸۹۱ء میں شایع ہوا۔ اس میں ایک اہم سماجی مسئلے یعنی بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ مولوی صاحب نے اپنی ایک تقریر میں بھی اس ظلم کی طرف اشارہ کیا تھا جو ایک عرصے سے ہندوستان میں بیوہ عورتوں پر کیا جاتا رہا۔ انھوں نے اس پر دلی غم کا اظہار کیا کہ ہندوؤں میں ستی کا رواج ہے یعنی بیوہ اپنے شوہر کی چتا میں جل مرتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں میں بھی بیوہ عورتوں کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا بلکہ

---

[1] سید افتخار عالم مارہروی: حیات النذیر، صفحہ ۲۳۶

بعض جگہ رواج ہے کہ بیوہ کا سر مونڈ کر اسے بدشکل بنا دیتے ہیں کہ کوئی اس کی طرف متوجہ ہی نہ ہو۔ لیکن اب صورت حال بدل چکی ہے اور اس خوشگوار تبدیلی میں اس ناول کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہے۔

ایامیٰ آزادی بیگم کی درد بھری زندگی کی داستان ہے۔ وہ جوانی میں بیوہ ہو جاتی ہے اور پھر دنیا اس کے ساتھ انصاف نہیں کرتی۔ بلاشبہ عزیز و اقارب خیال رکھتے ہیں، والدین حتی المقدور قربانیاں دیتے ہیں لیکن یہ خیال کسی کو نہیں آتا کہ ایک جوان عورت کی ضرورت صرف یہی نہیں کہ اسے روٹی کپڑا مہیا کر دیا جائے۔ آزادی بیگم نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ پھر خیال آیا کہ اور بیواؤں سے ان کا حال دریافت کرنا چاہیے۔ اس کام میں اسے بڑی مشکل سے کامیابی ہوئی اور پتہ چلا کہ بیواؤں کی زندگی کیسے درد و الم سے لبریز ہوتی ہے اور ایسے کتنے ہی موقعے آتے ہیں کہ ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے رہ جاتا ہے۔ آزادی بیگم بستر مرگ پر تھی تو اسے خیال آیا کہ چلتے چلتے بیواؤں کے لیے کوئی کام تو کرتے جاؤ۔ اس نے ایک جلسہ کر کے بہت سے مردوں کو مدعو کیا اور چلمن کے پیچھے سے تقریر کی۔ یہ تقریر ہی پورے ناول کا نچوڑ ہے۔ وہ بیواؤں کی زندگی کے تمام مسائل و مصائب نہایت تفصیل سے بیان کرتی ہے اور بلا جھجک کہتی ہے کہ "ان بیچاریوں کے شوہر فوت ہوتے ہیں نہ کہ وہ ضرورت فوت ہوئی ہے جس کی وجہ سے دنیا جہان میں نکاح ہوتے ہیں اور جس کی وجہ سے خود ان کے پہلے نکاح ہوئے تھے۔" اپنی تقریر مکمل کر کے آزادی بیگم آخری ہچکی لیتی ہے اور حاضرین جلسہ یہ تہیہ کر کے اٹھتے ہیں کہ وہ خدا اور رسول کا حکم بجا لائیں گے اور جہاں تک ممکن ہوگا بیواؤں کو نکاح ثانی کے بغیر نہ رہنے دیں گے۔

رویائے صادقہ

یہ مولوی نذیر احمد کا ساتواں اور آخری ناول ہے جو ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا۔ یہاں مصنف کے مذہبی عقائد ناول کے پیرائے میں ڈھل گئے ہیں۔ صادقہ اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔

وہ بچپن سے سچّے خواب دیکھتی ہے۔ لوگ اس کے بارے میں طرح طرح کے وہموں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ خیال عام ہو جاتا ہے کہ اس پر کسی جن بھوت کا اثر ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس کی چھوٹی دونوں بہنیں تو بیاہی جاتی ہیں مگر اس کا رشتہ کہیں سے نہیں آتا۔

ایک دن صادقہ کے والد کو ایک خط موصول ہوتا ہے۔ یہ خط کیا ہے پوری کتاب ہے۔ علی گڑھ کے ایک طالب علم سید صادق نے صادقہ سے رشتے کے لیے پیام دیا ہے اور ساتھ ہی اپنے مذہبی عقائد تفصیل سے بیان کر دیے ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ جدید تعلیم نے اس کے مذہبی عقائد کو متزلزل کر دیا ہے۔ کالج کی تعلیم سے مذہب کو جو خطرے ہو سکتے تھے اس خط کے پردے میں ان کا بیان ہو گیا ہے۔ بہرحال لڑکی کے والدین کو یہ رشتہ قبول کرنے میں تامل تھا لیکن صادقہ اپنی سہیلی کے ذریعے ماں باپ سے کہلواتی ہے کہ اس نے خواب میں دیکھا ہے یہ رشتہ ہو کے رہے گا۔ انجام کار شادی ہو جاتی ہے۔

سید صادق کی اُلجھن روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے۔ وہ عقل کے ذریعے مذہب کو سمجھنا چاہتا ہے اور سمجھ نہیں پاتا۔ جب یہ گرہ کسی طرح نہیں کھلتی تو خدا سے مدد مانگتا اور دعا کرتا ہے "اے خدا اگر واقع میں تو خدا ہے جیسا کہ تمام اہلِ مذاہب تجھ کو مانتے ہیں تو مجھ کو اس ورطۂ حیرت سے نکال اور حق بات میرے دل میں ڈال۔" اِدھر جملہ پورا ہوتا ہے اور اُدھر صادقہ سوتے سے اُٹھ بیٹھتی ہے۔ اس نے خواب دیکھا ہے کہ ایک بزرگ صادق کی اُلجھنوں کو سلجھا رہے اور اس کے سوالوں کے جواب دے رہے ہیں۔ بار بار اسے تسلّی دیتے ہیں کہ گھبرا مت۔ تیرے تمام شکوک و شبہات اور وہم ابھی دور ہو جائیں گے۔ صادق کے کہنے پر وہ خواب کا سارا ماجرا سوال و جواب کی شکل میں لکھ دیتی ہے۔ یہاں مولوی نذیر احمد اپنے مذہبی عقائد سرسید کے استدلالی انداز میں پیش کر دیتے ہیں۔ جدید تعلیم نے نئی نسل کے دلوں میں جو وسوسے پیدا کر دیے تھے ان سب کو دلیلوں سے رفع کرتے ہیں۔ یہی ناول کی تصنیف کا مقصد ہے۔ آخر کار سید صادق اپنے باپ دادا کے دین پر سچّے دل سے ایمان لے آتے ہیں اور پوری طرح اس پر کاربند ہو جاتے ہیں۔

ناول نگاری کی خصوصیات

مولوی نذیر احمد ہماری زبان کے پہلے ناول نگار ہیں۔ ان سے پہلے اُردو میں ناول نہیں تھا داستانیں تھیں۔ داستان میں کوئی ایک قصہ نہیں بلکہ قصّوں کا جنگل ہوتا تھا۔ ایک کہانی سے دوسری اور دوسری سے تیسری کہانی پھوٹتی تھی اور یہ سلسلہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ ان داستانوں میں وہ دنیا نظر نہ آتی تھی جس میں ہم آپ سانس لیتے ہیں بلکہ ایک خیالی دنیا دکھائی دیتی تھی جس میں ہم سے انسان کم، پریاں، جن، بھوت، دیو، شہزادے شہزادیاں اور درویش زیادہ بستے تھے۔ اس دنیا میں قدم قدم پر ایسے واقعات پیش آتے تھے جنھیں آج عقل تسلیم نہیں کر سکتی۔ حیوان انسان کی زبان میں گفتگو کرتے تھے، پریاں شہزادوں کو لے اُڑتی تھیں، جادوگر ہیرو کے راستے میں مصیبتوں کے پہاڑ کھڑے کر دیتے تھے لیکن ہیرو بھی طرح طرح کے ہتھیاروں سے لیس ہوتا تھا۔ کبھی وہ سلیمانی ٹوپی پہن کے دشمن کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا، کبھی بال جلا کے کسی دیو یا جن کو اپنی مدد کے لیے بلا لیتا اور ناممکن کو ممکن کر دکھاتا۔

یہ تھیں ہماری داستانیں جو خیالی دنیا کی تو سیر کراتی تھیں مگر حقیقی دنیا سے نظر ملانے کا انھیں حوصلہ نہ تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ جس طرح ہو سکے وقت کٹ جائے اور جب تک ممکن ہو انسان زندگی کی تلخیوں اور نامرادیوں سے بے خبر رہے۔ لیکن جلد ہی دنیا میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اصل ادب وہ ہے جس سے مسرت بھی حاصل ہو اور بصیرت بھی یعنی اس کا مطالعہ باعثِ انبساط بھی ہو اور اس کے ذریعے اپنے گرد بکھری ہوئی زندگی کو اچھی طرح دیکھنے اور سمجھنے

کا موقع بھی ملے۔ داستانیں اصلی دنیا اور سچی زندگی سے کوسوں دور بھاگتی تھیں اس لیے یہاں دوسری شرط کے پورا ہونے کا سوال ہی نہ تھا۔ اس بنا پر داستانوں سے بیزاری عام ہوئی اور ناول وجود میں آیا۔

حقیقت نگاری

ناول کو اس آئینے سے تشبیہ دی گئی ہے جس میں جیتی جاگتی دنیا کا عکس نظر آئے۔ گویا ناول نام ہے زندگی کی تصویر کشی کا۔ اور نذیر احمد کے ناول اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ زندگی کی تصویر کشی وہ اس کامیابی سے کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو اس پر اکثر اپنے گھر اور اپنے ماحول کا گمان گزرتا ہے اور ان کے کردار جانے پہچانے سے لگتے ہیں۔ افتخار عالم نے لکھا ہے کہ اکبری اصغری کے قصے کو لوگ سچا واقعہ خیال کرتے تھے اور کتنے تو ان بہنوں کے گھروں کا پتہ پوچھتے پھرتے تھے۔ بہتوں کو یہ شبہ بھی ہوا کہ کہیں اس ناول میں ان کے اپنے خاندان کو تو بے نقاب نہیں کیا گیا۔ ابن الوقت کو سرسید کا چربہ کہا گیا، حجۃ الاسلام کو مولوی نذیر احمد کا عکس بتایا گیا اور آزادی بیگم میں مولوی صاحب کی ایک بیوہ سالی کا عکس ڈھونڈ نکالا گیا۔ مختصر یہ کہ نذیر احمد کے ناولوں میں حقیقی زندگی کے مرقعے نظر آتے ہیں۔ ان کی نظر گہری ہے اور معمولی سے معمولی تفصیل بھی ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہو پاتی۔ ایک ماہر فنکار کی طرح وہ زندگی کے کسی قابل ذکر حصے کو منتخب کر لیتے ہیں اور قاش کی طرح تراش کر گویا محدب شیشے کے نیچے رکھ دیتے ہیں کہ اس کا ایک ایک حصہ پوری طرح نمایاں ہو جائے۔

افادی نقطۂ نظر

نذیر احمد کے عہد کو دو تہذیبوں کے تصادم کا عہد بھی کہا جا سکتا ہے اور اسے دورِ اصلاح کے نام سے یاد کرنا بھی مناسب ہے۔ دراصل یہ دونوں باتیں الگ نہیں بلکہ ایک ہی تصویر کے

دو رُخ ہیں۔ قوم کے باشعور افراد نے جب مشرقی تہذیب کا مغرب کے نئے حکمرانوں سے موازنہ کیا تو اپنی تہذیب کی بہت سی خامیاں ان پر روشن ہوگئیں اور وہ ان کی اصلاح پر کمر بستہ ہو گئے۔ مصلحین کے اس کارواں کے سالار بلاشبہ سرسید تھے لیکن بعض معاملات میں نذیر احمد کو ان پر فوقیت حاصل ہے۔ وہ چونکہ عربی زبان کے ماہر اور عالمِ دین بھی تھے اس لیے مذہبی مسائل میں افراط و تفریط سے محفوظ رہے۔ دوسرے یہ کہ ان کی طبیعت میں سرسید کی بہ نسبت زیادہ اعتدال و توازن تھا اور تیسری بات یہ کہ بعض اصلاحی امور میں وہ سرسید سے بھی آگے تھے مثلاً تعلیم و تربیتِ نسواں کی طرف انھوں نے سرسید سے زیادہ توجہ کی۔ بیواؤں کے عقدِ ثانی کی ضرورت کو انھوں نے پہلی بار دل نشیں پیرایے میں بیان کیا۔

مولوی نذیر احمد ادب کو محض وقت گزاری اور تفنن طبع کا ذریعہ نہیں خیال کرتے تھے۔ بلکہ اسے زندگی کو سنوارنے کا وسیلہ قرار دیتے تھے۔ ان کے تمام ناول اصلاحی نوعیت کے ہیں اور ایک واضح اصلاحی پروگرام کے تحت وجود میں آئے (مراۃ العروس اور بنات النعش لڑکیوں کی تربیت کے لیے لکھے گئے۔ توبۃ النصوح میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اولاد کی اصلاح والدین کا فرضِ اوّلیں ہے۔ ابن الوقت کے ذریعے یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اپنی تہذیب پر شرمانا اور بغیر سوچے سمجھے دوسروں کی نقالی کرنے کا انجام ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ فسانۂ مبتلا میں ایک سے زیادہ شادیوں کی خرابیاں بیان کی گئی ہیں، ایامیٰ میں بیواؤں کے عقدِ ثانی کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ رویائے صادقہ میں مذہبی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ کہیں نئی تعلیم حاصل کرنے والے نوجوان مذہب سے برگشتہ نہ ہو جائیں۔ غرض یہ کہ ان کے تمام ناول مقصدی اور اصلاحی ناول ہیں۔ عالمی ادب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً ساری زبانوں میں یہی صورتِ حال رہی ہے اور بیشتر ابتدائی ناولوں پر مقصدیت کا غلبہ رہا ہے۔ نذیر احمد کا دور تو انقلاب و اصلاح کا دور تھا۔ ان کے ناول مقصدیت سے دامن کس طرح بچا سکتے تھے۔

مختصر کینوس

نذیر احمد کے ناولوں کا کینوس بہت وسیع نہیں ہے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ انھوں نے ملک کے طول و عرض کا سفر نہ کیا ہو یا باہر کی دنیا سے بے خبر رہے ہوں۔ مذہب، ادب اور تعلیم کے علاوہ انھوں نے سیاست کے میدان میں بھی قدم رکھا اور سیاسی تقریریں بھی کیں لیکن ناول لکھتے وقت انھوں نے محدود گھریلو دنیا سے باہر قدم نہیں رکھا۔ ان کے تمام ناول درحقیقت گھریلو ناول ہیں۔ فنکار اپنے مقصد اور دل چسپی کا لحاظ کر کے اپنی تخلیق کا میدان متعین کرتا اور اپنے موضوع کا انتخاب کرتا ہے۔ تخلیقی عمل کا پہلا مرحلہ یہی ہے۔ فنکار اگر یہاں ناکام ہوا تو آگے ہر ہر قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے۔ نذیر احمد کے ذہن میں مقصد پوری طرح واضح تھا۔ انھوں نے اپنے ناولوں کے کینوس کو مختصر رکھا لیکن انھوں نے جو مرقعے پیش کیے ہیں ان میں اپنی گہری نظر اور فنی مہارت کا پورا ثبوت دیا ہے۔

پلاٹ

مولوی نذیر احمد کے سامنے اُردو کا افسانوی ادب محض داستانوں کی شکل میں موجود تھا اور ان داستانوں میں مربوط و منضبط پلاٹ کے پائے جانے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ لیکن وہ مغربی ناول سے بھی واقف تھے اور پلاٹ کا صحیح تصور ان کے ذہن میں کسی نہ کسی حد تک ضرور موجود تھا۔ ان کے ابتدائی ناولوں کے پلاٹ کمزور ہیں لیکن آگے چل کر وہ بے نقص پلاٹ پیش کرنے میں کامیاب ہوئے۔ مراۃ العروس کی بنیاد اکبری اصغری دو بہنوں کی زندگی ہے مگر دونوں کی زندگی کے واقعات الگ الگ بیان ہوئے ہیں۔ یہ دونوں آپس میں گتھ جاتے تو ایک مرکب پلاٹ وجود میں آتا جو زیادہ پُر اثر ہوتا لیکن مرکب اور پیچیدہ پلاٹ کو نبھالنے کا سلیقہ ابھی ناول نگار میں پیدا نہ ہوا تھا۔

بنات النعش کا پلاٹ بھی اکہرا ہے۔ اسے پہلے ناول کا ضمیمہ سمجھنا چاہیے۔ اسے تھامس ڈے کے سینڈفورڈ اینڈ برٹن کے انداز پر لکھا گیا ہے۔ ایک بدسلیقہ اور بد اطوار لڑکی کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے اصغری کے مدرسے میں داخل کیا جاتا ہے۔ یہاں دھیرے دھیرے اس کی عادتیں سدھرتی ہیں اور وہ پوری طرح علم سے بہرہ مند ہو جاتی ہے۔ گویا یہاں بھی پلاٹ سیدھا اور سپاٹ ہے۔ کہانی خط مستقیم پر سفر کرتی ہے۔ البتہ تیسرے ناول تک پہنچتے پہنچتے فن پر ان کی گرفت مضبوط ہو جاتی ہے۔ توبۃ النصوح کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناول نگار ادبی اور فنی تقاضوں کو اچھی طرح سمجھنے لگا ہے۔ اس ناول کے پلاٹ میں ترتیب و توازن کا حسن موجود ہے۔ واقعات میں ایسا ربط ہے کہ ایک کڑی دوسری کڑی سے جڑتی چلی جاتی ہے۔ ابن الوقت کا پلاٹ اور زیادہ پیچیدہ اور پُر اسرار ہے۔ مقصد نگار کبھی اپنی تخلیق کو گرفت سے باہر نہیں ہونے دیتا وہ پلاٹ اور کردار دونوں کو قابو میں رکھتا ہے اور ان سے حسب منشا کام لیتا ہے۔ اس سے بے ساختہ پن ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کبھی کرداروں کا عمل غیر فطری ہو جاتا ہے تو کبھی پلاٹ کی تعمیر حقیقت سے دور ہو جاتی ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں میں یہ عیب کم نظر آتے ہیں۔

پلاٹ کی تعمیر کے نقطۂ نظر سے ابن الوقت کو ایک کامیاب ناول قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس ناول کے مطالعے کے دوران بار بار اندازہ ہوتا ہے کہ واعظ و مقصد نگار نذیر احمد فنکار نذیر احمد کے آگے بے دست و پا ہو جاتا ہے اور پلاٹ کی تعمیر بالکل فطری اور حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ ناول نگار غیر جانب دار نظر آتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ نیکی و بدی کی فتح و شکست سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ حجۃ الاسلام کی تقریر کو خارج کر دیا جائے تو یہ عہد حاضر کے کسی جدید ناول کا پلاٹ معلوم ہوتا ہے۔ رویائے صادقہ کے ابتدائی ڈیڑھ سو صفحات پڑھ کر یہ خیال ہوتا ہے نذیر احمد کے ہاتھوں ایک بے عیب پلاٹ وجود میں آنے والا ہے مگر آگے چل کر مایوسی ہوتی ہے۔ صادقہ کے خواب کی طوالت پلاٹ میں جھول پیدا کر دیتی ہے اور

یہ دینی تعلیم کا رسالہ معلوم ہونے لگتا ہے۔

حسنِ ترتیب اور پلاٹ کی تعمیر کے لحاظ سے فسانۂ مبتلا نذیر احمد کا بہترین ناول ہے۔ یہاں مصلح نذیر احمد پر فنکار نذیر احمد نے فتح پالی ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے یہ ناول ابن الوقت سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہاں جزئیات نگاری میں نذیر احمد بالزاک کی اور ظرافت میں جین آسٹن کی ہمسری کرتے ہیں۔ پورے ناول میں متعدد بار اور مناسب وقفوں کے بعد طنز و ظرافت سے کام لیا گیا ہے جس سے ایک پیٹرن اور آہنگ پیدا ہو گیا ہے۔ ناول نگار نے اس ناول میں تجسس بھی پیدا کیا ہے جو آخر تک برقرار رہتا ہے اور دل چسپی میں اضافہ کرتا ہے۔ شروع میں قصے کی رفتار سست ہے مگر یہ بے سبب نہیں۔ ناول کے اس حصے سے مبتلا کی ذہنی ساخت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مختصر یہ کہ فسانۂ مبتلا کا پلاٹ اکہرا ہونے کے باوجود فنکارانہ ہے۔ ایامیٰ کا پلاٹ بھی گٹھا ہوا ہے مگر فسانۂ مبتلا سے کم۔ آزادی بیگم کی تقریر نے اس کے تناسب و توازن کو مجروح کر دیا ورنہ پلاٹ کے لحاظ سے یہ بھی انتہائی کامیاب ناول ہوتا۔

خلاصہ یہ کہ نذیر احمد پلاٹ کی تعمیر کا سلیقہ رکھتے تھے اور جیسے جیسے ان کے ناولوں کی تعداد بڑھتی گئی اس سلیقے میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ پلاٹ کے اعتبار سے فسانۂ مبتلا اور ابن الوقت ان کے بہترین ناول کہے جا سکتے ہیں۔ توبۃ النصوح اور ایامیٰ کے پلاٹ بھی کامیاب ہیں مگر نسبتاً کم۔ رویائے صادقہ کے پلاٹ کو مقصدیت کے غلبے نے نقصان پہنچایا۔ مراۃ العروس اور بنات النعش بالکل ابتدائی ناول ہیں۔ ان کے پلاٹ ناقص ہیں۔ یہاں مہارت کی کمی صاف نظر آتی ہے۔

کردار نگاری

نذیر احمد نے کردار نگاری میں بڑی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ ان کا تجربہ وسیع اور نگاہیں تیز تھیں۔ انھوں نے زندگی میں ٹھوکریں بھی کھائیں اور اعلیٰ سے اعلیٰ دنیوی منصب

بھی حاصل کیے۔ چنانچہ ہر قسم کے لوگوں کو دیکھنے اور برتنے کا موقع ملا۔ نظر ایسی تیز تھی کہ جس پر پڑی اسے اکسرے کی طرح آر پار دیکھ لیا۔ ذہن میں کیمرے کی سی خاصیت تھی کہ جو کچھ سامنے آیا نقش ہو گیا۔ مردم شناس ایسے تھے کہ ذہنِ انسانی کے پیچ وخم سے پوری طرح واقف اور انسانی نفسیات سے بخوبی آشنا تھے۔ جن دنوں پنجابیوں کے کٹرے کی مسجد میں قیام تھا تو پیٹ بھرنے کے لیے گھر گھر جانا پڑتا تھا۔ کسی کا مسالا پیستے، کسی کا سودا لا کے دیتے تب دو روٹیاں میسر آتیں لیکن اس بہانے متوسط طبقے کے مسلم گھرانوں کو اندر سے دیکھنے، ان کے رہن سہن کا مطالعہ کرنے اور ان لوگوں کے ذہنی رویوں کو سمجھنے کا موقع ملا۔ نذیر احمد نے کردار نگاری میں اپنے تمام تجربوں اور اپنی ساری صلاحیتوں سے پورا فائدہ اٹھایا اور ہمارے افسانوی ادب میں کئی زندۂ جاوید کرداروں کا اضافہ کر دیا۔ مرزا ظاہر دار بیگ، کلیم، ابن الوقت، مبتلا اور ہریالی

U 245 ۲۴۵

اردو ادب کے لافانی کردار ہیں۔

کردار نگاری کے سلسلے میں نذیر احمد نے مختلف فنی تدابیر اختیار کی ہیں۔ کبھی مصنف خود کرداروں کا تفصیلی تعارف کراتا ہے، کبھی کرداروں کے عمل سے ان کی طبیعتوں کا سراغ ملتا ہے اور کبھی ان کی گفتگو ان کی خاصیتوں پر روشنی ڈالتی ہے۔ نذیر احمد اپنے کرداروں کے متعلق معمولی سے معمولی بات کو نظر انداز نہیں ہونے دیتے اور ایک ایک کردار پر مختلف زاویوں سے اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ اس کے اصلی اور جاندار ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ حیات النذیر کے مصنف کے بیان کے مطابق دہلی میں لوگ اکبری اور اصغری کا پتہ پوچھتے تھے۔ آج تک لوگوں کا خیال ہے کہ ابن الوقت سر سید کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ آزادی بیگم، بوی صاحبہ کی بہن تھیں۔ نصوح، حجت الاسلام، دور اندیش خاں، میر متقی اور مبتلا نذیر احمد ہی کے بدلے ہوئے روپ نظر آتے ہیں۔

اس کے باوجود نذیر احمد کی کردار نگاری خامیوں سے یکسر پاک نہیں ہے۔ اس میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ ہر کردار یا صرف خوبیوں کا مجموعہ ہے یا محض بدی کا مجسمہ۔ یہ حقیقت

ناول نگار کی نظروں سے اوجھل رہی کہ انسان نیکی و بدی اور خیر و شر کا مجموعہ ہے۔ آل احمد سرور کے الفاظ میں ان کے کردار یا فرشتے ہوتے ہیں یا شیطان، اصلی انسان نہیں ہوتے۔ اصلی انسان کی تصویر نہ تو سیاہ رنگ سے بنائی جا سکتی ہے نہ سفید رنگ سے بلکہ دونوں رنگوں کی آمیزش سے یہ تصویر وجود میں آتی ہے۔ جس میں سیاہی غالب ہوتی ہے وہ بُرا کہلاتا ہے اور جس میں سفیدی نمایاں ہوتی ہے اسے نیک سمجھا جاتا ہے۔ ظاہر دار بیگ میں خود غرضی، مکاری اور نمود و نمایش کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اصغری اور فہمیدہ سرتاسر نیکی ہی نیکی ہیں حجت الاسلام اور میر متقی سارے عیبوں سے پاک ہیں۔ اکبری میں نیکی کی رمق نظر نہیں آتی۔ نذیر احمد ایک ستم اور کرتے ہیں۔ وہ اپنے کردار کو نام کیا دیتے ہیں یوں کہیے کہ لیبل لگا دیتے ہیں۔ اور کردار کے نام سے اس کی جملہ خصوصیات واضح ہو جاتی ہیں۔ کلیم ضرور خوش کلام ہوگا، فہمیدہ یقیناً ذی عقل ہوگی، ظاہر دار بیگ میں ظاہر داری کے سوا کچھ نہ ملے گا، کلیم کو پکڑنے کے لیے مرزا زبردست بیگ دوڑے گا تو بیچارہ کلیم بھاگ کر کہاں جائے گا، نصوح کا کام نصیحت کرنا ہی ہوگا۔ دور اندیش کی فراست کا قایل ہونا پڑے گا۔ مبتلا ضرور مبتلائے الم ہوگا۔ اس طریق کار کا نقص یہ ہے کہ تجسس باقی نہیں رہتا پہلے سے طے ہو جاتا ہے کہ کس موقع پر کردار کا کیا رویہ ہوگا۔ اسی خصوصیت کی بنا پر نذیر احمد کے ناولوں کو اخلاقی تمثیلیں کہا گیا لیکن صرف ناموں کی بنا پر ایسا فیصلہ صادر کر دینا قرینِ انصاف نہیں۔

دوسرا عیب یہ ہے کہ نذیر احمد کے کرداروں میں ارتقا کم نظر آتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ خواہ انسان کی بنیادی سرشت نہ بدلے لیکن وہ کسی نہ کسی درجے میں ماحول اور حالات سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ نذیر احمد کے بیشتر کردار شروع سے آخر تک یکساں رہتے ہیں۔ حالات ان پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہو پاتے۔ ظاہر دار کا فریب بے نقاب ہو جاتا ہے مگر اس میں ذرا سی تبدیلی بھی نہیں آتی۔ ابن الوقت حجت الاسلام کے آگے لاجواب ہو جاتا ہے مگر اس کا دل نہیں بدلتا۔ ہر یالی تائب ہو جانے کا لاکھ سوانگ رچائے مگر

بری عادتوں سے اسے نجات نہیں ملتی۔ کلیم کے کردار میں آخری وقت میں تبدیلی ہوتی ہے جو غیر فطری معلوم ہوتی ہے۔ بتلا کا کردار البتہ حالات سے تبدیل ہوتا ہے اور یہ تبدیلی حقیقی و اصلی معلوم ہوتی ہے۔ صادق کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آتی ہے۔

نذیر احمد کے زیادہ تر کردار سادہ اور سپاٹ ہیں لیکن کلیم، ابن الوقت، بتلا، ہریالی، ماما عظمت کے کرداروں کو مدوّر (راؤنڈ) کردار کہا جاسکتا ہے۔ ان کے ذہنی پیچ و خم کو نذیر احمد نے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ابن الوقت کی جذباتی کشمکش اور نفسیاتی پیچیدگی کو ناول نگار نے بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ میر متقی کے رخصت ہوجانے کے بعد بتلا کا ذہن طوفانوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے دل اسے ایک طرف کھینچتا ہے تو دماغ دوسری طرف۔ اس کشمکش کو ناول کے صفحات پر پیش کردینا آسان کام نہ تھا لیکن نذیر احمد نے اس معاملے میں بڑی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ ہریالی کے ظاہر و باطن کے تضاد نے اسے سپاٹ کرداروں کی سطح سے بلند کردیا ہے۔ بلکہ اس ناول کے کئی کرداروں کے مختلف ابعاد مختلف موقعوں پر سامنے آتے ہیں۔ جب یہ راز فاش ہوجاتا ہے کہ ہریالی خادمہ نہیں بلکہ بتلا کی منکوحہ بیوی ہے تو غیرت بیگم کی حالت متغیر ہوجاتی ہے اور انتہائی تکلیف کے عالم میں اس کے منہ سے بے ربط جملے نکلتے ہیں۔ نذیر احمد کرداروں کی پیشکش میں انسانی نفسیات کی گہری بصیرت کا ثبوت دیتے ہیں اور ان کے قلم سے لافانی کردار وجود میں آتے ہیں۔

مکالمہ نگاری

مکالمہ نگاری میں نذیر احمد کو بڑی مہارت حاصل ہے۔ ان کے ہر کردار کی زبان سے وہی مکالمے ادا ہوتے ہیں جو اس کی شخصیت سے مطابقت رکھتے ہوں اور موقع محل کے عین مطابق ہوں۔ ان کے کرداروں کی گفتگو سننے والا محض اس گفتگو سے ان کرداروں کے بارے میں بہت کچھ جان سکتا ہے۔ ان کے بیشتر مکالموں سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ

ان کا ادا کرنے والا کون ہے، کس مزاج کا ہے، اور اس کی پرورش کس ماحول میں ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی اس کی عمر کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ مکالمہ نگاری میں نذیر احمد کی اس کامیابی کے کئی اسباب ہیں۔ اوّل تو نذیر احمد ایک کثیر المطالعہ انسان تھے اور زبان پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی۔ وہ مشکل سے مشکل بات اور پیچیدہ سے پیچیدہ خیال کو سہل بنا کے بات چیت کی زبان میں ادا کرنے کا گُر جانتے تھے۔ دوسرے وہ انسانی نفسیات کے رمز شناس تھے اور تیسرے یہ کہ عملی زندگی کے وسیع تجربے سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ انھوں نے ہر قسم اور ہر طبقے کے لوگوں کو نزدیک سے دیکھا تھا۔ اس لیے خوب جانتے تھے کہ کس شخص کی زبان سے کس موقعے پر کیا الفاظ ادا ہوں گے۔

نذیر احمد اپنے کرداروں کا تفصیلی تعارف بھی کراتے ہیں، کرداروں کے عمل سے بھی ان کی شخصیتوں کو نمایاں کرتے ہیں لیکن جو چیز نذیر احمد کے کرداروں کے سمجھنے میں سب سے زیادہ معاون ہوتی ہے وہ ان کے اپنے مکالمے ہیں۔ مراۃ العروس اور بنات النعش ان کے ابتدائی ناول ہیں۔ ان میں متعدد خامیاں موجود ہیں لیکن مکالمہ نگاری میں مولوی صاحب کو جو قدرت حاصل ہے اس کا اظہار یہیں سے ہونے لگا ہے۔ اکبری اور اصغری کی سیرت کا اندازہ ان کی اپنی گفتگو سے ہی ہوتا ہے ان کی گفتگو اور اس کا انداز ہو بہو ویسا ہی ہے جیسا متوسط طبقے کے مسلمان گھرانوں میں ہو سکتا ہے۔ حسن آرا بنات النعش کا مرکزی کردار ہے۔ محمودہ سے اس کی گفتگو یوں ہوتی ہے۔

محمودہ۔ محتاج کے سر میں کیا سینگ ہوتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر محتاجی اور کیا ہوگی کہ آپ کا ایک دن بھی بے نوکروں کے نہیں کٹ سکتا۔ بھلا میں پوچھتی ہوں ماما نہ ہو تو کھانا کون پکائے، لونڈیاں نہ ہوں تو پانی کون پلائے، منہ کون دھلائے، پنکھا کون جھلے، چیز کون اٹھا کر دے، چارپائی کون بچھائے۔ بچھونے کون کرے، گھر میں جھاڑو کون دے۔ یہ تو روزمرہ کے کام ہیں۔ کھانا، کپڑا، برتن، زیور اور

ضرورت کی کل چیزیں چھوٹی یا بڑی یہاں تک کہ پانی پینے کا مٹی کا آبخورہ، کنگھی، سوئی، سلائی کیا آپ نے اپنے ہاتھوں بنائی ہیں؟

حسن آرا۔ بے شک ضرورت کی سب چیزیں اور لوگ بناتے اور ٹہل خدمت بھی کرتے ہیں۔ مگر کیا کوئی چیز ہم کو مفت دی جاتی ہے اور کیا بے لیے کوئی ٹہل خدمت کرتا ہے۔ ہر چیز اور ہر کام کے لیے ہم روپیہ خرچ کرتے ہیں روپے کے لالچ سے لوگ خود بخود چیزیں لیے دوڑے چلے آتے ہیں۔ بے بلائے ٹہل خدمت کرنے کو حاضر ہوتے ہیں۔ روپیہ ہو تو گھر بیٹھے دنیا بھر کا سامان لے لو اور نوکر تو ایک صبح رکھو ایک شام۔

توبۃ النصوح میں کلیم کی ادبی اور شاعرانہ گفتگو، مرزا ظاہر دار بیگ کی جھوٹ اور مکاری سے بھری باتیں، نعیمہ کی اپنی ماں سے بے ادبی سے بات چیت، ان کرداروں کے مزاج کو پوری طرح نمایاں کرتی ہے۔ ابن الوقت اور رجعت الاسلام کے مکالمے طویل ہونے کے باوجود بہت دل چسپ ہیں۔ ایامیٰ میں آزادی بیگم کی خود کلامی اس کی ذہنی تہوں کو کھولتی اور اس کے باطن کو بے نقاب کرتی ہے۔ اس زیر لب گفتگو سے اس کی ذہنی کشمکش کا پتہ چلتا ہے۔ فسانۂ مبتلا میں مکالمہ نگاری کے عمدہ نمونے نظر آتے ہیں۔ مبتلا کے چچا میر متقی کی آمد پر بھانڈ آپس میں جو طنزیہ گفتگو کرتے ہیں وہ دل چسپ بھی ہے اور اس عہد کے افکار پر روشنی بھی ڈالتی ہے۔ ہریالی کی مبتلا سے گفتگو، غیرت بیگم کی ماما سے بات چیت، مبتلا کی عارف سے بحث، نذیر احمد کی مکالمہ نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔ مبتلا ہریالی سے نکاح کر کے اسے خادمہ کے بھیس میں گھر لے آتا ہے لیکن آخر کار ایک روز یہ راز افشا ہو جاتا ہے۔ غیرت بیگم اس صدمے کو برداشت نہیں کر پاتی۔ اس کی حالت متغیر ہو جاتی ہے۔ غصے کے عالم میں اس کی زبان سے بے ربط فقرے نکلتے ہیں جن سے اس کی ذہنی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ غصے میں کہتی ہے۔

غیرت بیگم ۔ ”یہ ہریالی نہیں گھروالی ہے ۔ یہ بی بی ہے ۔ یہ میری سوکن ہے ۔ میں رانڈ ہوں یہ سہاگن ہے ۔ میں لونڈی ہوں یہ بیگم ہے میں چڑیل ہوں یہ حور ہے ۔ یہ میاں کی لاڈو ہے ۔ یہ میاں کی چہیتی ہے ۔ یہ میاں کے کلیجے کی ٹھنڈک ہے ۔“

نذیر احمد کے پہلے ناول سے ہی ان کی مکالمہ نگاری کا قائل ہونا پڑتا ہے لیکن اس فن میں مسلسل ارتقا نظر آتا ہے ۔ بعد کے ناولوں کے مکالمے اور بھی زیادہ کامیاب ہیں ۔ ان کے مکالموں کی خامیاں کہیں کہیں کھٹکتی ہیں ۔ بعض جگہ ان کے مکالمے ضرورت سے زیادہ طویل ہوجاتے ہیں ۔ یہ بالعموم ان موقعوں پر ہوتا ہے جہاں مذہبی امور زیر بحث آتے ہیں ۔ اس کا سبب نذیر احمد کا اصلاحی مشن اور مذہبی ذہن ہے ۔ ثقیل الفاظ کا استعمال بھی کہیں کہیں ناگوار گزرتا ہے ۔ ابتدائی ناولوں میں یہ عیب زیادہ نمایاں ہے ۔ محاوروں اور کہاوتوں کی بھرمار نے بھی ان کے مکالموں کو داغدار کیا ہے لیکن یہ تینوں خامیاں ہر جگہ نہیں بلکہ کہیں کہیں نظر آتی ہیں ۔ مجموعی طور پر نذیر احمد مکالمہ نگاری کے فن میں کامیاب ہیں ۔

زبان و بیان

نذیر احمد عربی زبان کے عالم تھے ۔ اس کے علاوہ دیندار آدمی تھے اور قرآن وحدیث سے خاص شغف رکھتے تھے ۔ اس لیے ان کی تحریروں پر عربیت کا غلبہ ہے ۔ ان کے قلم سے عربی کے ثقیل اور نامانوس الفاظ بے اختیار نکل جاتے ہیں ۔ اور یہ صورت ناولوں میں بھی پیش آتی ہے جبکہ ناول کے ناقدین نے اس پر زور دیا ہے کہ ناول نگار کو اس سے احتراز کرنا چاہیے ۔ ناول نگار کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی زبان کو ناول کے موضوع اور قاری کے درمیان حائل نہ ہونے دے ۔ ناول کی زبان کھڑکی میں لگے ہوئے شیشے کے مانند ہوتی ہے جس سے آر پار صاف نظر آتا ہے اور ایک ناقد کے الفاظ میں ناول نگار کا کام یہ ہے کہ وہ اس شیشے کو شفاف رکھے تاکہ اس کے پار نظر آنے والا منظر صاف نظر آئے ۔ نذیر احمد کی زبان اکثر قاری

کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے جو ایک ناول نگار کا عیب ہے۔ لیکن تیسرے ناول میں یہ عیب کم ہو جاتا ہے۔ یعنی توبۃ النصوح کی زبان زیادہ صاف اور شگفتہ ہے۔ مولوی صاحب ع۔ن کے اثر سے اپنا دامن بالکل تو نہ بچا سکے لیکن رفتہ رفتہ ان کے ناولوں کی زبان زیادہ صاف اور شگفتہ ہوتی گئی۔

محاورات کی کثرت سے نذیر احمد کی زبان کبھی آزاد نہ ہو سکی۔ ان کی تحریروں میں جو محاورے اور کہاوتیں استعمال ہوئی ہیں انھیں یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ کبھی کبھی تو وہ ایک ایک سطر میں کئی کئی محاورے استعمال کر جاتے ہیں۔ یہ شوق اس حد کو پہنچا ہوا ہے کہ کبھی کبھی محاورات کا بے محل استعمال کر جاتے ہیں۔ امہات الامہ میں بعض محاورے اس طرح استعمال ہوئے کہ بزرگانِ دین کی شان میں گستاخی کا پہلو پیدا ہو گیا اور اس کتاب کو نذرِ آتش کر دینا پڑا۔

مولوی صاحب بڑے ظریف آدمی تھے۔ ان کی تحریریں چٹکلوں، لطیفوں اور دلچسپ قصوں سے بہت پُرکشش ہو گئی ہیں۔ ان کے ناولوں کے بعض کردار ظرافت کا کافی مواد فراہم کر دیتے ہیں۔ توبۃ النصوح کے مرزا ظاہر دار بیگ اور فسانۂ مبتلا کے بھانڈ اس کی اچھی مثالیں ہیں۔ ظرافت مولوی صاحب کی ایسی کمزوری ہے کہ سنجیدہ موقعوں پر بھی اس سے احتراز نہیں کر پاتے۔

نقطۂ نظر

ناول کے جو اصول متعین کیے گئے تھے ان میں نقطۂ نظر کو بھی ضروری قرار دیا گیا تھا۔ نذیر احمد کے ناول اس کسوٹی پر پورے اُترتے ہیں۔ وہ ایک واضح نقطۂ نظر کے حامل تھے۔ وہ مشرقی اقدار کے حامی اور اسلامی روایات کے علمبردار تھے۔ انھوں نے اپنے ناولوں کو اصلاحِ معاشرت اور استحکامِ دین کا وسیلہ بنایا گویا وہ افادی ادب کے قائل

تھے اور اس سے زندگی کو سنوارنے کا کام لینا چاہتے تھے۔

دل چسپی کا عنصر

ہمارا دور ادبی روایات کی شکست و ریخت کا دور ہے۔ روایت سے انحراف تو ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے لیکن اب روایت سے مکمل بغاوت کا زمانہ ہے۔ عہدِ حاضر کے ناول نے تمام مسلمہ اصولوں سے کنارا کر لیا ہے۔ اب ناول کے لیے نہ پلاٹ ضروری ہے نہ روایتی کردار اور نہ نقطۂ نظر لیکن یہ عام طور پر آج بھی محسوس کیا جاتا ہے کہ ناول میں دل چسپی کا عنصر بہرحال موجود ہونا چاہیے۔ جو قاری کی توجہ کو پوری طرح گرفت میں لیے رہے۔ نذیر احمد کے تمام ناول اس شرط کو پورا کرتے ہیں۔

●

لکچر

مولوی نذیر احمد جس پائے کے مصنف تھے اسی پائے کے مقرر بھی تھے۔ لیکن اپنی اس صلاحیت کا انھیں دیر سے پتہ چلا۔ انھوں نے پہلا لکچر ۵/ اکتوبر ۱۸۸۸ء کو ٹاؤن ہال دہلی کے عام جلسے میں دیا۔ اس لکچر پر ایسی واہ واہ ہوئی کہ چاروں طرف سے تقریروں کے تقاضے ہونے لگے۔ مولوی صاحب کو بھی اپنی اس پوشیدہ صلاحیت پر یقیناً ناز ہوا ہوگا۔ بہرحال ان کا تقریری ملکہ پوری طرح ملک و ملت کے کام آیا۔ انھوں نے مختلف مقامات پر ایسے شاندار لکچر دیے کہ سارے ملک میں دھوم مچ گئی۔ ان کی تقریروں کے اہم مراکز تھے — محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، انجمن حمایت اسلام لاہور اور مدرسہ طبیہ دہلی۔ سرسید تو اپنے وقت کے زبردست مردم شناس تھے۔ جوہر قابل کو پہچاننے میں انھیں ذرا دیر نہ لگتی تھی۔ انھوں نے اکثر اہل کمال کا پتہ لگایا اور ان کی صلاحیتوں سے قوم کو فیض پہنچایا۔ انھوں نے اپنی تعلیمی تحریک کے فروغ میں نذیر احمد کے لکچروں سے بہت فائدہ اٹھایا۔ کانفرنس کے سالانہ اجلاس مختلف مقامات پر ہوا کرتے تھے۔ جس شہر میں اجلاس ہوتا سرسید انھیں اصرار کرکے وہاں لے جاتے اور بالعموم آخر میں ان کا لکچر رکھواتے تاکہ سامعین اس کے اشتیاق میں آخر تک رُکے رہیں۔ کبھی اتفاق سے لکچر پہلے ہو جاتا تو بھیڑ چھٹ جاتی تھی۔ مولوی صاحب بھی موقع محل کی مناسبت سے ایسی تقریر کرتے تھے کہ سامعین پر جادو سا ہو جاتا تھا۔ ان کی بات میں ایسی تاثیر تھی کہ مجمعے کو ہم خیال بنا لیتے تھے اور چندے کی اپیل کرتے تو حاضرین

کی جیبیں خالی کرا لیتے تھے۔

اس کامیابی کا سبب یہ تھا کہ ان میں وہ ساری خوبیاں موجود تھیں جو ایک اعلیٰ درجے کے مقرر میں پائی جانی چاہئیں۔ سب سے اہم بات تو یہ کہ وہ ایک وسیع المطالعہ شخص تھے جس موضوع کو اُٹھاتے اس کے ہر پہلو پر ان کی نظر ہوتی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ اس کا پوری طرح حق ادا کر دیتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ مولوی صاحب بڑے ذہین انسان تھے۔ وہ سامعین کی نفسیات کو خوب سمجھتے تھے۔ کس موقعے پر کیا کہنا چاہیے، کس بات پر کتنا زور دینا چاہیے، کیا پیرایۂ اظہار اختیار کرنا چاہیے۔ یہ سب وہ خوب جانتے تھے۔ اچھے مقرر کے لیے ضروری ہے کہ اس کی آواز اُونچی ہو لیکن بعض آوازیں ایسی کرخت اور ناگوار ہوتی ہیں کہ جو لوگ نزدیک بیٹھے ہوں ان کی سماعت کو ضرور تکلیف پہنچتی ہے۔ لیکن مولوی صاحب کی آواز اُونچی ہونے کے باوجود ناگوار نہ ہوتی تھی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے لکھا ہے کہ "ان کی آواز میں گرج تھی مگر لوچ کے ساتھ۔ کوئی دور سے سنے تو یہ سمجھے کہ مولوی صاحب کسی کو ڈانٹ رہے ہیں لیکن پاس بیٹھنے والا ہنسی کے مارے لوٹ رہا ہو۔ جوش میں آکر جب آواز بلند کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ترم بج رہا ہے۔ اسی لیے بڑے بڑے جلسوں پر چھا جاتے تھے اور پاس اور دور بیٹھنے والے دونوں کو ایک ایک حرف صاف سنائی دیتا تھا۔"

مقرر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ نہ تو سامعین کی کثرت سے مرعوب ہو، نہ ان کی وجاہت و لیاقت سے۔ مولوی صاحب کے سامعین کی تعداد ہمیشہ ہزاروں تک پہنچتی تھی۔ ان کے لکچر کا اعلان ہوتا تو ایک خلقت ٹوٹ پڑتی تھی۔ پھر ان جلسوں میں بڑے بڑے عالم فاضل اور ذی رتبہ اشخاص شریک ہوتے تھے مگر مولوی صاحب ان سے ذرا مرعوب نہ ہوتے تھے اور بڑے سے بڑے مجمعے پر چھا جاتے تھے۔ کثرتِ مشق سے یہ کمال یقیناً حاصل ہو جاتا ہے لیکن اُوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ مولوی صاحب تو آخرِ عمر میں اس فن کی طرف متوجہ ہوئے تھے چنانچہ اسے خداداد صلاحیت ہی کہا جا سکتا ہے۔

مولوی صاحب کے لکچر عام طور پر طویل ہوتے تھے۔ وہ اپنے لکچر پہلے سے لکھ لیا کرتے تھے بلکہ وہ لکچر چھپوا کر جلسے میں لایا کرتے تھے۔ بعض مقررین لکھی ہوئی تقریر کو جلسے میں پڑھ دیتے ہیں جس سے تقریر کا سارا لطف و اثر جاتا رہتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اچھی تقریر صرف مقرر کی زبان سے نکل کر سامعین کے کانوں تک ہی نہیں پہنچتی بلکہ اس کا ایک حصہ مقرر کی آنکھوں سے نکل کر سامعین کی آنکھوں میں اترتا اور پھر ان کے دلوں میں گھر کرتا ہے۔ اس لیے ضروری ہوا کہ مقرر سامعین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تقریر کرے۔ مولوی صاحب کا یہ کمال تھا کہ لکھی ہوئی لمبی سے لمبی تقریر انھیں زبانی یاد ہو جاتی تھی اور بیچ بیچ میں تحریر پر نظر ڈالنے کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ لوگوں نے تقریر کے جلسے ذہن نشین کر کے مطبوعہ لکچر سے مقابلہ کیا اور سر مو فرق نہ پایا۔ یہ اور بات ہے کہ بیچ بیچ میں موقع محل کے مطابق کچھ نہ کچھ اضافہ کرتے جاتے تھے۔ لکھی ہوئی تقریر میں ایک خرابی پیدا ہونے کا ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے۔ تقریری زبان تحریری زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ ہوشیار مقرر اگر پہلے سے تقریر لکھیں تو اس کا خیال رکھتے ہیں کہ تقریر پر تحریر کا گمان نہ گزرے۔ مولوی صاحب اس گُر سے خوب واقف تھے۔ ان کے لکچر کہیں سے بھی پڑھ لیجے، کہیں بھی تقریر پر مضمون کا شبہ نہیں ہوتا۔ وہ جملوں کی ساخت اور الفاظ کے انتخاب پر خصوصی توجہ دیتے تھے اور پھر تقریر کے وقت طرزِ ادا کا خاص خیال رکھتے تھے۔ آواز کے مناسب اتار چڑھاؤ سے ان کی تقریر زیادہ پُر تاثیر ہو جاتی تھی۔ ان کے اس کمال کے سبھی معترف تھے۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے پرنسپل مسٹر ماریسن جنھوں نے بڑے بڑے مقرروں کو سنا تھا مولوی صاحب کے لکچروں، خاص طور پر ان کے طرزِ ادا کے گرویدہ تھے۔ ایک بار انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے لیے لکھ کر لکچر تیار کیا اور سید افتخار عالم سے درخواست کی کہ وہ ان کے ساتھ اٹاوے چلیں اور ان کا لکچر پڑھ دیں۔ وہ تیار ہو گئے تو پرنسپل صاحب نے چاہا کہ وہ پڑھنے کی مشق کر لیں۔ مشق کے دوران وہ بار بار ٹوکتے کہ اس لفظ کو یوں ادا کرو، یہاں آواز اُونچی کرو، یہاں توقف کرو، اب یہ لہجہ اختیار کرو۔ پھر پوچھا "تم نے

مولوی نذیر احمد کا لکچر سنا ہے؟" انھوں نے جواب دیا "جی ہاں"۔ تو بولے "تم ان کی نقل کیوں نہیں اتارتے۔ وہ ایسے مقرر ہیں کہ یورپ میں پیدا ہوتے ہوتے تو ہر طرف ان کی تقریروں کی دھوم ہوتی۔ میں نے ایسا لاجواب مقرر آج تک نہیں دیکھا۔"

مولوی صاحب عربی زبان وادب کے ماہر اور عالم دین تھے۔ وہ اپنی تقاریر میں آیاتِ قرآنی، احادیث اور عربی اقوال کا کثرت سے استعمال کرتے تھے۔ جس سے ان کے لکچر زیادہ باوقعت ہوجاتے تھے اور سامعین جو بیشتر مسلمان ہوتے تھے انھیں زیادہ توجہ اور احترام سے سنتے تھے لیکن مولوی صاحب انسانی نفسیات کے ماہر تھے اور فضا کو بوجھل یا زیادہ سنجیدہ نہ ہونے دیتے تھے۔ چنانچہ بیچ بیچ میں پُرلطف واقعات، تاریخی اور نیم تاریخی قصّے، چٹکلے اور لطیفے سنا سنا کر حاضرین کو ہنساتے اور محظوظ کرتے جاتے تھے۔ ان کے مزاج میں ظرافت بہت تھی اور اس سے وہ اپنے لکچروں میں بہت کام لیتے تھے۔ نجی محفلوں میں تو وہ اکثر پھکڑپن پر اُتر آتے تھے لیکن جب لکچر میں ظرافت سے کام لیتے تو متانت وشائستگی کا دامن نہ چھوڑتے تھے۔

مولوی صاحب کے لکچر پر اکثر یہ اعتراض کیا گیا بلکہ انھوں نے خود اعتراف کیا کہ تقریر کرتے کرتے وہ کہیں سے کہیں جا نکلتے ہیں۔ اُوپر عرض کیا جاچکا کہ وہ اپنی تقریر پہلے سے لکھ لیا کرتے تھے گویا انھیں یہ موقع میسر تھا کہ جو کچھ کہنا ہے پہلے سے اس کی منصوبہ بندی کرلیں۔ تقریر میں بہکنے اور کہیں سے کہیں جا نکلنے کا یہ انداز شعوری تھا۔ سامعین کو اکتاہٹ سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ ایک سوچی سمجھی تدبیر تھی۔ حاضرینِ جلسہ کے ذہن جب کسی خاص بات کو مسلسل سننے اور اس پر غور کرنے سے تھک جاتے تھے تو یہ تدبیر ذرا دیر کو انھیں راحت بہم پہنچا دیتی تھی۔ اس بہکنے کے اور بھی کئی فائدے تھے اس سے سامعین کے ذہنوں کو کسی اور سمت میں سفر کرانے اور کسی نئے موضوع پر معلومات فراہم کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

ہمارے ہاں جلسوں اور تقریروں کا رواج تو بہت بعد میں ہوا لیکن مشاعرے شروع ہی سے مقبول تھے۔ یوں بھی شعر نثر سے زیادہ پُرتاثیر ہوتا ہے۔ مولوی نذیر احمد جہاندیدہ انسان

تھے اور اپنے سامعین کی پسند سے پوری طرح واقف۔ وہ اپنے لکچروں کو شعروں کے استعمال سے زیادہ پرکشش بناتے تھے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ موقع ملتا تو لکچر تیار کرنے کے ساتھ ساتھ اس جلسے کے لیے ایک طویل نظم بھی کہہ لیتے اور اسی سے اپنے لکچر کا آغاز کرتے۔ یہ نظم ایک طرح سامعین کو شروع ہی سے گرفت میں لے لینے کا ایک کارگر حربہ ہوتی تھی۔

مولوی نذیر احمد نے جب لکچر دینے کا سلسلہ شروع کیا تو ان کے قلم سے ہزاروں صفحات نکل چکے تھے اور ان کا مطالعہ اپنی معراج کو پہنچ چکا تھا۔ مطلب یہ کہ انھیں زبان پر حاکمانہ قدرت اور اظہار مدعا پر مکمل قابو حاصل ہو چکا تھا۔ ان کے لکچروں کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مشکل سے مشکل مسئلے اور پیچیدہ سے پیچیدہ خیال کو باتوں باتوں میں ادا کر دیتے تھے اور پتہ بھی نہ چلتا تھا کہ کیسی سنگلاخ چٹانیں پانی ہو کے بہ گئیں۔ جب کسی اہم مسئلے پر اظہارِ خیال کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ کوئی تند و تیز دریا بہ رہا ہے اور ان کا زورِ بیان سامعین کو مسحور کر دیتا تھا۔

تحریر کی طرح ان کی تقریر بھی محاوروں سے خالی نہ ہوتی تھی۔ محاوروں کی یہ کثرت کبھی کبھی ناگوار گزرتی ہے۔ یہی حال عربی اور انگریزی کی بھرمار کا ہے۔ عربی اور انگریزی کے پورے پورے فقرے جا بجا استعمال ہوئے ہیں۔

مولوی نذیر احمد سے درجنوں تصانیف یادگار ہیں لیکن اپنی سوانح قلمبند کرنے کا انھیں موقع نہیں ملا۔ حالانکہ ان کی سوانح ناول سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ ان لکچروں سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ان کی زندگی کے بہت سے واقعات خود ان کی زبان سے بیان ہو گئے۔ بہت سی باتیں تو ایسی ہیں کہ مولوی صاحب ان کا ذکر نہ کرتے تو کسی کو معلوم بھی نہ ہوتیں اور خاطر خواہ ان کی سوانح مرتب نہ ہو پاتی۔ انھوں نے اتنے بہت سے لکچر دیے کہ زندگی کے ہر پہلو پر کہیں نہ کہیں روشنی پڑ ہی گئی۔ مسجد میں رہائش، مولویوں کی خدمت اور گداگری کے قصے اگر وہ خود اپنے لکچروں میں ڈنکے کی چوٹ بیان نہ کر دیتے تو کم سے کم

مولوی صاحب کے جیتے جی انھیں دہرانے کی کسی کو ہمت نہ ہوتی اور کون جانے ان کے بعد یہ بھولی بسری کہانیاں ہو جاتیں۔ خود ان کی زبانی ہی ہمیں یہ علم ہوتا ہے کہ ان لکچروں کا سلسلہ محض اتفاق سے چل نکلا۔ کہتے ہیں :-

"میں اپنے زعم میں بہت ہی آزادانہ زندگی بسر کرتا ہوں۔ نہ کسی کالج کا بانی ہوں نہ کسی انجمن کا سکریٹری، نہ کسی اخبار کا اڈیٹر۔ لوگوں کی مدح و ذم سے مستغنی۔ تحسین و تحمیق سے بے نیاز۔ میں نے ساری عمر لکچر نہیں دیے۔ خدمت سے علیحدہ ہو کر خانہ نشیں ہوا۔ نہیں معلوم لوگوں نے کیونکر سمجھ لیا کہ میں ہوا کا رُخ پہچانتا ہوں۔ جو کچھ آپ سمجھتا ہوں دوسروں کو سمجھا سکتا ہوں بشرطے کہ سمجھنا چاہیں اور سمجھ کے پیچھے لاٹھی لیے نہ پھر رہے ہوں۔ دس دفعہ بلایا ایک دفعہ آکھڑا ہوا اور آکھڑا ہوا تو کیونکر ہو سکتا ہے کہ دل میں ہو کچھ اور کہوں کچھ۔ مجھ سے اختلاف ہو تو مجھے جو جی چاہے کہو اور جو جی چاہے سمجھو مگر از برائے خدا یہ نہ کرنا کہ جیسے سید احمد خاں کے ساتھ مجھ کو سمیٹ لیا اس انجمن بیچاری کو سان لو۔"

یہی سید احمد خاں تو تھے جنھوں نے مولوی نذیر احمد کو مصنف سے بڑھ کے مقرر بنا دیا۔ مولوی صاحب بھی ان کے ایسے قدر دان تھے کہ ہزار اختلافات کے باوجود آخر تک تعلیمی مشن میں ان کے ہمنوا اور مددگار رہے۔ سید صاحب جہاں لے جاتے یہ بے تامل جاتے اور اپنی تقریر سے چندے کا مینہ برسا دیتے۔ ایک بار سید احمد خاں چندہ جمع کرنے لاہور پہنچے۔ منتظمین نے شاہی مسجد میں بعد نمازِ جمعہ جلسے کا اہتمام کیا لیکن نماز کے بعد مسجد میں کوئی بھی نہ ٹھہرا۔ سب یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گئے کہ سید احمد بے دین ہے، کافر ہے، نیچری ہے، انگریزوں کا پٹھو اور قوم کا غدار ہے۔ اس کی بات کون سنے۔ آخر سرسید اور ان کے گرد چند منتظمین رہ گئے۔ منتظم شرمندہ اور سرسید آبدیدہ۔ دہلی میں یہ خبر مولوی نذیر احمد نے سنی۔ انھوں نے سرسید سے کہلا بھیجا کہ اگلے جمعہ تک لاہور میں ٹھہریں اور گلی کوچوں میں بڑے بڑے

اشتہار لگوادیں کہ دہلی سے ایک جغادری مولوی آرہے ہیں جو جمعہ کو شاہی مسجد میں سرسید سے مناظرہ کریں گے۔ سرسید کے مخالفین کو اس خبر سے بہت خوشی ہوئی کہ سرِعام سرسید کی درگت بنے گی۔ اگلے جمعہ کو مسجد میں جگہ ملنی مشکل ہوگئی۔ نماز کے بعد مولوی صاحب اپنے جبہ و قبہ سمیت اُٹھے اور گرجدار آواز میں سرسید کو ملامت کرتے رہے۔ کوئی عیب نہ تھا جو اُن میں نہ گنایا ہو۔ پھر آواز مدھم کرکے بولے کہ بھائیو اِسے کیا کہوں کون سا عیب ہے جو مجھ میں موجود نہیں ذرا دیر اپنی مذمت کرنے کے بعد بولے کہ دوستو ذرا تم بھی اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی عیبوں سے بری نہ ہوں۔ اس کے بعد قرآن وحدیث کا سہارا لے کر کہا کہ خدا کا حکم اور رسول کا ارشاد ہے کہ دشمن بھی کچھ کہے تو توجہ سے سنو اور عقل کی کسوٹی پر پرکھو۔ یہ تو تمھارے بچوں کے لیے کالج بنا رہے ہیں اور اسی کے سلسلے میں کچھ کہنے آئے ہیں۔ اب کون تھا جو دل سے سرسید کی بات سننے کو آمادہ نہ ہوتا۔

سرسید کی وفات کے بعد مولوی صاحب میں لکچر دینے کا ولولہ باقی نہ رہا اور مدرسۂ طبیہ کے سالانہ جلسے میں انھوں نے یہ عذر پیش کیا کہ —

"سید احمد خاں کے مرنے کی وجہ سے میری طبیعت حاضر نہیں اور جیسے لکچر کی توقع مجھ سے لوگ رکھتے ہیں، میں دے نہیں سکتا۔ میں کیا کروں میرا یہ حال ہوگیا ہے کہ جب کبھی لکچر یا پبلک اسپیچ کا خیال کرتا ہوں سید احمد خاں کی صورت سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔ ان کا تصوّر بندھا اور طبیعت بے قابو ہوئی۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ لکچر اور پبلک اسپیچ وغیرہ کی گدگدی ہم لوگوں میں اُسی مرحوم نے پیدا کی تھی۔ پس خود لکچر دینے کھڑا ہوتا ہوں تب سید احمد خاں یاد آتے ہیں، کسی کو لکچر دیتے دیکھتا ہوں تب سید احمد خاں یاد آتے ہیں۔"

یہی خیال ایک جگہ شعروں میں یوں ڈھل گیا ہے ؎

کیا کروں مشغلہ لکچر کا اجی چھوٹ گیا ہم سے اک یار چھٹا ایسا کہ جی چھوٹ گیا

صبر رخصت ہوا سنتے ہی ترا عزم سفر تم تو کل جاؤ گے یہ ہم سے ابھی چھوٹ گیا
نہ سہی پر تجھے دکھلاؤں گا اپنی پرواز گر قفس سے ترے صیاد کبھی چھوٹ گیا

ہر چند سرسید کی وفات سے مولوی صاحب دل شکستہ اور لکچروں سے بیزار ہو گئے تھے مگر یہ سلسلہ منقطع نہ ہو سکا۔ لوگوں کے اصرار کے آگے انھیں ہتھیار ڈالنے ہی پڑتے تھے لیکن مولوی صاحب کے ساتھ ایک ایسا حادثہ پیش آیا کہ آخر کار یہ سلسلہ ختم ہو کے رہا۔ ان کے بعض لکچروں پر بُری طرح لے دے کی گئی۔ خاص طور پر ان کے ایک لکچر "فطرۃ اللہ" کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ مولوی محرم علی چشتی ان معترضین میں پیش پیش تھے۔ انھوں نے اس لکچر کے خلاف اپنے اخبار رفیق ہند میں اعتراضات کا تار باندھ دیا اور ذاتیات پر حملے کرنے لگے۔ مولوی صاحب نے ان پر ازالۂ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا۔ آخر انھوں نے معافی مانگی لیکن اس واقعے نے مولوی صاحب کو لکچروں سے بد دل کر دیا اور انھوں نے عہد کر لیا کہ اب کبھی لکچر نہ دیں گے۔ اس طرح مولوی صاحب کے معرکۃ الآرا لکچروں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں مولوی صاحب کی تقاریر کے چند اقتباسات پیش کر دیے جائیں۔

"میں سرسید احمد کا بھاٹ نہیں۔ وہ اگر پیر ہوں تو ان کا مرید نہیں۔ استاد ہوں تو ان کا شاگرد نہیں، مرثیہ خواں ہوں تو ان کا بسوریا نہیں، امیر ہوں اور مجھ کو معلوم ہے کہ نہیں ہیں لیکن امیر ہوں تو ان کا دست نگر نہ کبھی تھا نہ اب ہوں اور نہ انشاء اللہ مدت العمر ہوں گا۔ مگر ہے کیا۔ آدمی ہوں۔ دوست دشمن میں تمیز کرنے کی۔ قومی حالت اور قومی ضرورتوں کی شناخت کی عقل رکھتا ہوں۔ تمھارے اس لاہور میں اور لاہور کیا چیز ہے علی گڑھ میں اور علی گڑھ کے شہر میں میں بھی نہیں نیچر گڑھ میں یعنی محمڈن کالج میں خود سرسید اور ان کے حواریین کے رودر رو میں نے اس بات کے کہنے میں مطلق باک نہیں کیا اور کیوں کرتا کہ میں ان

کے سب نہیں بعض معتقدات کو غلط سمجھتا ہوں لیکن جیسا مجھ کو ان کی غلطیوں کا تیقن ہے اس بات کا بھی تیقن ہے کہ وہ شخص منافق نہیں۔ بزدل نہیں۔ مکار نہیں اور قومی خیر خواہی سے ایسا سرشار ہے کہ اس کا بس چلے تو اپنی تو پہلے ہی سے اتار رکھی ہے دوسروں کی پگڑی بھی اتار کر مسلمانوں کے حوالے کر دے۔

* * *

انجمن میں بارہ مہینے امیر خانی رمضان رہتا ہے۔ امیر خانی رمضان کا قصہ یہ ہے کہ امیر خاں پنڈارا ایک لٹیرا آدمی تھا اور اس نے اپنی قسم کے سپاہی جمع کر لیے تھے۔ ان لوگوں کو کبھی تنخواہ نہیں دی جاتی تھی۔ اتفاق سے نقالوں کا ایک طائفہ اس کے لشکر میں پہنچا اور لوگوں کو اپنا تماشا دکھانا چاہا۔ لوگوں نے عذر کیا کہ ہم کو دانے گھاس کی مشکل پڑی رہتی ہے تم کو انعام و اکرام کہاں سے دیں گے۔ سرگروہ طائفہ نے کہا کہ ہمارا تماشا کراؤ تو ایسی نقل کریں گے کہ شاید تمھاری تنخواہیں بھی تقسیم ہو جائیں۔ چنانچہ ایک شخص بہت بزرگ صورت آموجود ہوئے۔ طائفے میں سے ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت آپ کون بزرگ ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ رمضان شریف۔ اتفاق سے وہ مہینہ شاید ربیع الاوّل کا تھا تو دوسرے نے حیران ہو کر پوچھا کہ رمضان شریف کے آنے کا اس مہینے میں کون سا موقع ہے انھوں نے جواب دیا کہ تم کو معلوم نہیں میری تعیناتی امیر خاں کے لشکر میں ہے صرف ایک مہینے کی رخصت ملتی ہے اس میں سارے جہان میں پھر آتا ہوں اور پھر اپنے ٹھکانے آ لگتا ہوں۔ سنا ہے کہ یہ حکایت امیر خاں کے کان تک پہنچی اور اس نے تنخواہ کے تقسیم کیے جانے کا حکم دیا۔"

دیگر تصانیف

ناولوں کے علاوہ اور بہت سی تصانیف مولوی نذیر احمد سے یادگار ہیں۔ ان کے لکچر بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ وہ لکچر پہلے سے لکھ کر تیار کر لیا کرتے تھے۔ اس لیے ان کا شمار بھی تصانیف میں کیا جانا چاہیے۔ ان کے چوالیس مطبوعہ لکچر موجود ہیں جنھیں مولوی صاحب کے فرزند مولوی بشیر الدین احمد نے دو جلدوں میں مرتب کر کے ۱۹۱۸ء میں شایع کر دیا تھا۔ یہ لکچر ہمارے زبان و ادب میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں اس لیے ایک علیحدہ باب میں ان پر گفتگو کی گئی ہے۔

مولوی صاحب کے خطوط بھی شایع ہوئے ہیں اور یہ بھی لائق مطالعہ ہیں۔ یہ خطوط مولوی بشیر الدین کے نام لکھے گئے ہیں۔ ان کے دوست سید عبد الغفور شہباز نے ان خطوط کو ترتیب دے کر ۱۸۸۷ء میں موعظۂ حسنہ کے نام سے شایع کیا۔ مولوی صاحب نے اپنے خطوں میں جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ ہے تعلیم۔ یہ تعلیم ہی تھی جس کے سبب انھوں نے ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کیے۔ ان کی فطری خواہش تھی کہ ان کا اکلوتا بیٹا بھی اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور ہو اور دوسرے ضروری علوم کے ساتھ انگریزی زبان میں بھی مہارت حاصل کرے۔ مولوی صاحب نے بعض جگہ تعلیمی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے، کہیں یہ سمجھایا گیا ہے کہ انگریزی کس طرح بولنی چاہیے اور بعض خطوط تو سبق کے طور پر لکھے گئے اور ان کا مقصد عربی زبان و ادب کی تدریس ہے۔

اس کے علاوہ مولوی صاحب نے جتنا کام کیا اسے درسی اور مذہبی دو حصّوں میں تقسیم

کیا جا سکتا ہے لیکن یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ان کے نظامِ فکر میں مذہب کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اس لیے ان کی درسی کتابوں پر بھی مذہبیت غالب ہے۔ یہاں پہلے درسی اور پھر مذہبی کتابوں کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

منتخب الحکایات۔ یہ کتاب ستّر حکایتوں پر مشتمل ہے جن میں سے کچھ طبع زاد ہیں، کچھ عام کہانیاں ہیں اور بعض دوسری زبانوں سے لی گئی ہیں۔ یہ کتاب انھوں نے ۱۸۶۹ء میں اپنی چھوٹی بیٹی کے لیے تیار کی تھی۔ اس میں شامل ہر حکایت سے کوئی نہ کوئی سبق ملتا ہے جسے آخر میں واضح بھی کر دیا گیا ہے۔

چند پند۔ یہ نصیحت آمیز کتاب مولوی صاحب نے ۱۸۶۹ء میں اپنے بیٹے کے لیے تصنیف کی تھی۔ اس میں مختلف عنوانات کے تحت مختصر مضامین آسان زبان میں لکھے گئے ہیں۔ عنوانات اس قسم کے ہیں۔ صفائی، صحت، غصہ، لالچ، تکبر، ادب، بات چیت۔ آخر میں مذہب اور اس کے تحت بعض پیغمبروں کے مختصر حالات تحریر کیے گئے ہیں۔

صرفِ صغیر۔ صرف چوبیس صفحوں پر مشتمل قواعد فارسی کا مختصر رسالہ ہے جو ۱۸۶۹ء میں مرتب ہوا۔ اس میں جا بجا قواعد کو نظم بھی کیا گیا ہے تاکہ آسانی سے طالب علموں کے ذہن نشین ہو جائے۔

نصاب خسرو۔ یہ دراصل خالق باری کی تبدیل شدہ صورت ہے۔ یہ اٹھائیس صفحات کی ایک نظم ہے جس میں عربی فارسی کے زیادہ استعمال ہونے والے الفاظ یاد کرانے کی تدبیر کی گئی ہے۔ مولوی صاحب نے متروک الفاظ کو نظم سے خارج کر کے بہت سے اشعار کا اضافہ کر دیا ہے۔ ان اشعار میں ایسے الفاظ سکھائے گئے ہیں جن کو مولوی صاحب ضروری خیال کرتے تھے۔

رسم الخط۔ یہ بھی تیس صفحوں کا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں املا کے قاعدے درج ہیں۔ اس کے بعض اہم عنوانات ہیں۔ حرفوں کی پوری شکل، مرکبات، قواعد متعلقہ ترکیب لاحق، ترکیب لاحق کی تقطیع، قواعد متعلقہ ترکیب سابق، قواعد متعلقہ ترکیب طرفین، متفرق قاعدے، خاتمہ۔

مایغنیك فی الصّرف۔ یہ عربی صرف پر سو صفحے کی کتاب ہے اور اس غرض سے

تیار کی گئی تھی کہ انعام ملے گا اور سرکار کی طرف سے منظور ہو کر مدارس میں داخلِ نصاب ہو گی لیکن مولویوں نے اسے پسند نہ کیا ورنہ وہ اسی انداز پر نحو کی ایک کتاب بھی لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے بہرحال اس کتاب کے ذریعے ان کے بیٹے بشیر الدین نے عربی سیکھی۔ یہ کتاب ۱۸۹۲ء میں تیار ہو کر ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی۔

مبادی الحکمت۔ مبادیاتِ منطق پر یہ ایک مختصر رسالہ ہے۔ حکومت کی جانب سے ایک اشتہار جاری کیا گیا تھا کہ طلبہ کی درسی ضرورت کے لیے منطق کی ایک ابتدائی کتاب درکار ہے۔ ملک کے گیارہ مصنفوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ مولوی صاحب کی کتاب منتخب ہو کر داخلِ نصاب ہوئی۔

ترجمۃ القرآن۔ ابتدا میں تو مولوی صاحب کلام پاک کے ترجمے کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان اصل الفاظ کو بھول گئے تو اسلام کی آب و تاب جاتی رہے گی لیکن آخر کار اس رائے میں انقلاب پیدا ہوا اور وہ ترجمے کو اس لیے ضروری سمجھنے لگے کہ قرآن حکیم کو سمجھے بغیر عقائد میں پختگی آنی محال ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ خود اس کام کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے بڑی محنت سے اور عربی کے چند عالموں کی اعانت سے کلام پاک کا ترجمہ کئی سال میں مکمل کیا اور بار بار اس پر نظر ثانی کی۔ یہ ترجمہ بہت سلیس اور بامحاورہ اردو میں تھا اس لیے بے حد مقبول ہوا اور بہت قلیل عرصے میں اس کے متعدد ایڈیشن شایع ہوئے۔

ترجمۃ القرآن کے ساتھ ہی تین کتابیں اور مرتب ہو گئیں۔ یہ ہیں ۱۔ ادیۃ القرآن اس میں قرآنِ پاک سے منتخب کی گئی دعائیں اور ان کا ترجمہ شامل ہے۔ ۲۔ ہفت سورہ۔ مروجہ پنج سورہ میں دو سورتوں — سورۂ فتح و بنا — کا اضافہ کر کے شایع کرایا۔ ۳۔ دہ سورہ۔ اس میں دس سورتیں شامل ہیں۔

الحقوق والفرائض۔ یہ کتاب تین جلدوں میں ہے اور انسانی زندگی بالخصوص اسلامی زندگی کا دستور العمل ہے۔ اس میں دینی مسائل کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے شگفتہ زبان

میں ذہن نشین کرایا گیا ہے۔

اجتہاد۔ اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ تمام اصولِ اسلام مطابقِ عقل ہیں۔ اس کتاب کی تصنیف کا مدّعا یہ تھا کہ سائنس کی تعلیم سے مذہبی عقائد میں جو تزلزل پیدا ہو رہا ہے اس کو روکا جائے۔ اس میں توحید، شرک، رسالت، معجزات وغیرہ عنوانات کے تحت مفصل و مدلل گفتگو کی گئی ہے۔ بزرگانِ دین کے حالات بطور ضمیمہ شامل کیے گئے ہیں۔

امہات الامّہ۔ اس کا موضوع ہے تعددِ ازدواج جس پر ایک زمانے سے اعتراض ہوتے رہے ہیں۔ مصنف نے اعتراضات کے مدلّل اور مسکت جواب دیے ہیں۔ ڈیڑھ سو صفحات کی اس کتاب میں مناظرے کے انداز سے احتراز کرتے ہوئے استدلال کا ڈھنگ اختیار کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں احکامِ قرآنی کی تشریح کی گئی ہے۔

بعض اہم تراجم اس کے علاوہ ہیں۔ انڈین پینل کوڈ کا ترجمہ، تعزیرات ہند بہت بڑا کارنامہ ہے اور یہ آج بھی اسی طرح رائج ہے۔ مولوی صاحب اس ترجمے میں شریکِ غالب تھے۔ یکم جنوری ۱۹۱۰ء کو دہلی میں ایڈورڈ ہفتم کی تاج پوشی کا جلسہ ہوا تھا۔ اس کے حالات انگریزی میں اسٹیفن وھیلر نے قلمبند کیے تھے۔ مولوی صاحب نے اس کتاب کا "تاریخِ دربار تاج پوشی" کے نام سے ترجمہ کیا۔

●

طرزِ تحریر

فرانسیسی ادیب بوفوں (BUFFON) اسلوب کو مصنف کی شخصیت کا پرتو قرار دیتا تھا۔ گویا اسلوب ایک ایسا آئینہ ہے جس میں مصنف کی شخصیت صاف نظر آتی ہے۔ ہم کسی تحریر کو دیکھ کر بے اختیار پکار اٹھتے ہیں یہ محمد حسین آزاد ہیں، یہ ابوالکلام ہیں، یہ مولوی نذیر احمد ہیں، یہ شبلی ہیں۔ کسی مصنف نے اپنی تخلیقات کے دائرے کو کسی خاص میدان تک محدود رکھا ہے تو اس کو پہچان لینا زیادہ دشوار نہیں لیکن جو اہل قلم کثیر التصانیف ہوتے ہیں اور جو گوناگوں مضامین کا انتخاب کرتے ہیں ان کی شناخت اسی وقت ممکن ہے جب وہ بلاشبہ صاحبِ طرز ہوں۔

مولوی نذیر احمد کے قلم سے ہزاروں صفحات نکلے اور وہ بھی مختلف موضوعات پر لیکن ان کی تحریر کا کمال یہ ہے کہ پہلی نظر میں مصنف کا پتہ بتاتی ہے۔ اور ایک ایک سطر کے پیچھے مصنف کی شخصیت جلوہ فگن نظر آتی ہے۔ مولوی صاحب نے بہت سی کتابیں لکھیں لیکن جس چیز نے اردو ادب میں انھیں زندۂ جاوید کر دیا وہ ان کے ناول ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے یہی دیکھنا چاہیے کہ انھوں نے اپنے ناولوں میں کیسی زبان استعمال کی اور کیا پیرایۂ بیان اختیار کیا۔

مولوی نذیر احمد کے ناولوں کا کینوس اس لحاظ سے محدود ہے کہ وہ زیادہ تر گھر کی چار دیواری میں محصور ہیں۔ فنکار کی توجہ متوسط درجے کے مسلمان گھرانوں تک محدود رہتی ہے اس کے باوجود نوبل صاحب اور ابن الوقت سے لے کر ظاہر دار بیگ اور چلبلا بھانڈ تک

اور ادھر فہمیدہ بیگم سے لے کر ماما عظمت اور ہریالی تک ہر طبقے اور ہر طرح کے کردار ان کے ہاں موجود ہیں۔ یہ کردار بالکل فطری زبان میں یعنی اپنے طبقے کی مناسبت سے اور اپنی عمر کے مطابق گفتگو کرتے ہیں۔ بعض جگہ تو مکالمہ نگاری کا یہ کمال ایسے عروج کو پہنچا ہوا ہے کہ صرف چند مکالمے سُن کر ہمیں اس کردار کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہو جاتی ہے جس کی زبان سے یہ ادا ہوتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں مختلف پیشوں کے لوگ نظر آتے ہیں ان میں سے ہر ایک ایسے الفاظ کا استعمال کرتا ہے جو اُس پیشے کے لوگوں میں بولے جاتے ہیں۔ پھر بوڑھوں کی گفتگو کا انداز الگ ہے اور بچوں کی گفتگو کا الگ۔ متوسط درجے کی مستورات کی زبان خادماؤں کی زبان سے جداگانہ ہے۔ غرض ان مکالموں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ فنکار کو شاعرانہ، عالمانہ، سادہ، بامحاورہ اور ظرافت آمیز ہر طرح کی زبان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ کلیم کے مکالموں پر شعریت غالب ہے، حجۃ الاسلام قرآن و حدیث کے حوالوں سے عالمانہ گفتگو کرتے ہیں، بتلا کی باتوں میں سادگی ہے، ظاہر دار بیگ نے اعلیٰ طبقے کے لوگوں کی صحبت اُٹھائی ہے مگر آدمی ہے کم علم۔ اس لیے سادہ زبان بولتا ہے، ہریالی لچھے دار باتیں کرتی ہے، نسوانی کردار عام طور پر دلّی کی بامحاورہ زبان بولتے ہیں، خادماؤں کی زبان ان سے اس حد تک مختلف ہے جتنی ہونی چاہیے۔ چلبلا بھانڈ مصیبت کے وقت بھی مسخرا پن سے باز نہیں آتا۔

لیکن ان سب کرداروں پر حاوی ہے خود فنکار کا اپنا کردار۔ جو فنکار ہونے کے ساتھ ساتھ واعظ بھی ہے اور اس کی گفتگو کا انداز وہی ہے جو ایک واعظ و ناصح کا ہونا چاہیے یعنی عالمانہ و باوقار۔ وہ عربی فارسی کے عالم تھے اور ان کا ذخیرۂ الفاظ بھی بے پناہ تھا اس لیے کہیں ادائے مطالب میں دشواری نہ ہوتی تھی اور ہر موقع کے لیے اس ذخیرے سے مناسب الفاظ نکل آتے تھے۔ تلاش الفاظ کا کمال دیکھنا ہو تو ان کے تراجم کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے۔ وہ ترجمہ کرتے ہوئے بڑی آسانی سے لفظ کی جگہ لفظ بٹھا دیتے تھے اور بقول

فرحت اللہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے نگینہ جڑ دیا ہو۔

مولوی نذیر احمد کی عربی و فارسی دانی سے ان کی نثر کو بلاشبہ کچھ نقصان بھی ضرور پہنچا۔ وہ یہ کہ اس میں جا بجا ثقیل الفاظ داخل ہو گئے جو اتنی مدت گزر جانے کے بعد آج زیادہ ناگوار ہوتے ہیں ممکن ہے ان کے زمانے میں یہ صورت نہ رہی ہو۔ ان کے ہاں آیاتِ قرآنی، احادیث اور عربی مقولوں کا بھی کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے ہاں مذہبیت کا غلبہ ہے۔ اپنے ناولوں سے انھوں نے تبلیغِ دین اور اصلاحِ معاشرت کا کام لیا، درسی کتابیں تیار کیں تو وہاں بھی خدمتِ اسلام کا جذبہ کارفرما رہا۔ اور اس کے علاوہ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ خالص مذہبیات کے دائرے میں آتا ہے۔

مولوی نذیر احمد کے اسلوب کی ایک اور نمایاں خصوصیت محاورات کی کثرت ہے۔ مولوی صاحب کا یہ شوق حدِ اعتدال سے تجاوز کر گیا تھا۔ بعض جگہ تو صاف پتہ چلتا ہے کہ محاورے زبردستی ٹھونسے گئے ہیں۔ زمانہ مطالب علمی میں نذیر احمد کو زنانخانوں میں جا کے مستورات کے کاموں میں ہاتھ بٹانا پڑتا تھا۔ وہاں انھیں نسوانی زبان اور دہلی کے محاورے سننے کا موقع ملا۔ ہر بات کو غور سے سنتے تھے اور بہت اچھا حافظہ پایا تھا۔ چنانچہ یہ اندوختہ آخر وقت تک کام آتا رہا اور ہمیشہ یہ فکر رہی کہ جتنے محاورے یاد ہیں انھیں کہیں نہ کہیں کھپا دیں۔

انگریزی زبان انھوں نے ملازمت کے دوران سیکھی تھی اور ہمیشہ اس پر فخر کرتے تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں جو کچھ ہوں اسی انگریزی کی بدولت ہوں۔ یہ بات مبالغے سے خالی نہیں۔ وہ انگریزی بالکل نہ جانتے تب بھی اردو ادب میں ان کا وہی رتبہ ہوتا جو آج ہے۔ اپنی انگریزی دانی کی وہ جا و بے جا نمائش بھی کرتے تھے۔ چنانچہ تقریر و تحریر دونوں میں انگریزی کے پورے پورے فقرے استعمال کر جاتے تھے۔ یہ غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں اور طبیعت پر گراں گزرتے ہیں۔ مولوی صاحب کی اس خامی کو انگریزی کی مرعوبیت ہی کہا جا سکتا ہے۔

ان کے مزاج میں ظرافت بے حد و حساب تھی۔ سامعین و قارئین کی توجہ کو اپنی گرفت میں

لینے کے لیے تقریر میں بھی اور تحریر میں بھی اس سے خوب کام لیتے تھے۔ کبھی وہ کوئی پُر لطف قصہ سناتے ہیں، کہیں چٹکلے اور لطیفے سے کام لیتے ہیں تو کہیں زبان کے چٹخارے سے لطف دو بالا کرتے ہیں۔ اس ظرافت نے ان کے ناولوں کو زیادہ پرکشش بنا دیا ہے اور درسی کتابوں میں دل چسپی کا عنصر پیدا کر دیا ہے لیکن ان کی مذہبی تصانیف کو متانت کی کمی سے نقصان پہنچا ہے۔

مولوی نذیر احمد کی نثر کی ایک اہم خوبی ہے زورِ بیان۔ ان کا لہجہ پُر جوش اور اثر انگیز ہے۔ ان کی نثر میں بلند آہنگ الفاظ اس ترتیب سے استعمال ہوتے ہیں کہ پوری عبارت میں زور پیدا ہو جاتا ہے۔ اس خصوصیت میں وہ منفرد ہیں اور بہ آسانی پہچانے جاتے ہیں۔

●

مزید مطالعے کے لیے

مولوی نذیر احمد کی کتابیں

اہم ناول :۔ مراۃ العروس، توبۃ النصوح، فسانۂ مبتلا، ابن الوقت، رویائے صادقہ

اہم مذہبی تصانیف :۔ ترجمۃ القرآن، امہات الامہ، اجتہاد، الحقوق والعزائض

بعض درسی کتابیں :۔ منتخب الحکایات، چند پند، رسم الخط

دیگر تصانیف :۔ لکچروں کا مجموعہ، جلد اوّل و دوم مرتبہ بشیر الدین احمد، آگرہ ۱۹۱۸ء

(نوٹ : یہاں صرف اہم کتابوں کے نام درج کیے گئے ہیں، جملہ تصانیف کی تفصیل کتاب میں موجود ہے ایڈیشنوں کی صراحت اس لیے نہیں کی گئی کہ مولوی نذیر احمد کی تصانیف کے متعدد ایڈیشن شائع ہوتے ہیں)

مولوی نذیر احمد پر کتابیں

- حیات النذیر ـــــ سید افتخار عالم بلگرامی، شمسی پریس، دہلی ۱۹۱۲ء
- نذیر احمد کے ناول ـــــ ڈاکٹر اشفاق محمد خاں، جمال پریس، دہلی ۱۹۷۹ء
- نذیر احمد ـــــ شخصیت اور کارنامے ـــــ اشفاق اعظمی، نظامی پریس لکھنؤ، ۱۹۷۴ء
- مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی ـــــ مرزا فرحت اللہ بیگ

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۸۱ء